www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2022

اردو صحافت اور خواتین

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے　　سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:6 شمارہ:6 جون 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	نجمہ نکہت کی افسانہ نگاری	نہاں نورین	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		8
جہانِ نسواں	اردو غزل میں رنگ حنا کا حسن	سعدیہ صدف	9
	صنف نازک: علم و ادب سے خود مختاری تک	فردوسہ اختر	13
	رباعی کا خالص شاعر: عادل اسیر دہلوی	خوشبو پروین	16
اردو صحافت اور خواتین			
	محمدی بیگم کی ادبی و صحافتی خدمات	ڈاکٹر عرشیہ جبین	19
	اردو میں تانیثی صحافت	حقانی القاسمی	24
اعتراف ہنر	ڈاکٹر نعیمہ جعفری کی 'یادیں اور باتیں'	ڈاکٹر عبیداللہ چودھری	32
	انسانی کلیوں کی داستان: 'جوہی کی کلی'	ڈاکٹر قسیم اختر	38
حسن سخن	ڈاکٹر جوہی بیگم شاما، مسرور صغریٰ		42
افسانہ	ہاتھ کی لکیریں	شیریں نیازی	44
	نیت	طلعت فاطمہ	47
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		50
صحت	عالمی یوم ماحولیات اور انسانی صحت	ڈاکٹر محمد افروز عالم	52
آرائش و زیبائش			59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61
خواتین خبر نامہ			62

مشعل

عورت قدرت کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اسے ندیاں، جھرنے، آبشار، پہاڑ، دریا اور پیڑ پودوں سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ اسی کے باعث وہ قدرتی اشیا اور مناظر کی طرف کھینچی چلی جاتی ہے مگر فطرت سے چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے اب ماحول میں نہ وہ حسن ہے نہ کشش ہے۔ کارخانوں سے نکلنے والے دھوئیں اور زہریلی گیسوں کے اخراج سے ہمارا ماحول آلودہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہوا میں زہر پھیل چکا ہے۔ اوزون پرت میں چھید ہو چکا ہے اور یہ سب تشویش کا باعث ہیں۔

اس وقت جو ماحولیاتی آلودگی بڑھتی جا رہی ہے اس کی وجہ جنگلات کا کٹاؤ، ایندھن، گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں، فیکٹریوں سے نکلنے والی زہریلی گیس ان سب چیزوں کی وجہ سے آلودگی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس سے انسانی صحت بھی متاثر ہو رہی ہے اور انسانوں کی قوت مدافعت متاثر ہو رہی ہے۔ آلودگی نہ صرف بزرگوں اور جوانوں کے لیے بلکہ بچوں کے لیے بھی نہایت خطرناک ہے اس لیے ماحولیات کے تحفظ پر بہت زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ بہت سارے ممالک میں ماحولیات کے تحفظ کے تعلق سے سمینار اور دوسرے پروگرام بھی کیے جاتے ہیں تاکہ عوام کو ماحولیات کے تئیں بیدار کیا جائے۔ ہماری حکومت بھی ماحولیات کے تحفظ پر خصوصی توجہ دے رہی ہے اور عام افراد بھی ماحولیات کے تعلق سے کافی حساس اور بیدار نظر آ رہے ہیں۔ خواتین نے بھی ماحولیات کے تعلق سے بہت سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ماحولیات کے تحفظ میں خواتین بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں اس لیے خاتون قلمکاروں نے ماحولیات کے تعلق سے کہانیاں بھی لکھی ہیں، شعر بھی کہے ہیں اور اسی لیے ایکو فیمینیزم کے حوالے سے کچھ مطالعات بھی سامنے آ رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین ماحولیات کے تحفظ کے تئیں نہایت سنجیدہ ہیں اور وہ نہیں چاہتی ہیں کہ جو قدرتی حسن و کشش ہے اس سے انسانوں کا رشتہ ٹوٹ جائے کیونکہ یہی فطری قدرتی مناظر ہیں جو انسانی حواس پر اچھے اور مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اگر ماحول بہتر ہوگا تو یقینی طور پر صحت بھی بہتر ہوگی خاص طور پر ذہنی و نفسیاتی صحت کے لیے بہتر ماحول کا ہونا بہت ضروری ہے۔ آج جو بیماریاں بڑھ رہی ہیں اور جس طرح اکثر لوگ مختلف امراض کا شکار ہوتے جا رہے ہیں اس کی ایک وجہ ماحولیاتی آلودگی ہی ہے۔ اس لیے ذہنی و نفسیاتی اعتبار سے لوگوں کو صحتمند رکھنا ہے تو اس کے لیے ماحولیاتی آلودگی سے بچنے کی تمام تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔ شجرکاری اور دوسری چیزوں کے ذریعے ہم اپنے ماحولیات کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم پیڑ پودے لگاتے رہیں تاکہ ہمیں اچھی ہوا اور آکسیجن ملتی رہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شخصیت

نہاں نورین

نجمہ نکہت کی افسانہ نگاری

اردو زبان و ادب کی خدمات میں خواتین کی خدمات بے لوث ہیں۔ جو ان کی سیاسی اور سماجی بصیرت، علمی شفقت اور شعور کی پختگی کا بین ثبوت ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے عورت کے جذبات، احساسات اور اپنے جذبہ ایثار کو ہمیشہ سے ہی بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانے کے ابتدائی نقوش سے ہی خواتین ادیبائیں اردو ادب کے افق پر نظر آتی ہیں۔ ان کا مقصد محض اپنی نمائندگی نہیں بلکہ عصری تقاضوں کے تحت سماج کو سجانے، سنوارنے اور نابرابری کے خاتمے کا جذبہ بھی موجود ہے۔ ہر افسانہ نگار کا اسلوب الگ الگ ہوتا ہے۔ اسلوب ہی ان کو منفرد بناتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا الگ اسلوب ہوتا ہے۔ افسانہ کا موضوع کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اگر اسے اچھے اور مناسب ادبی اور معیاری اسلوب میں پیش نہ کیا جائے تو اس میں تاثر کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ایک ایسی ہی خاتون جن کے افسانوں میں تاثر پایا جاتا ہے ان میں اہم نام نجمہ نکہت کا ہے۔

نجمہ نکہت کا شمار حیدرآباد کی معروف افسانہ نگار خواتین میں ہوتا ہے۔ وہ انجمن ترقی ہند کی سکریٹری بھی رہی ہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار تھیں۔ ان کے افسانے حقیقت پر مبنی ہوتے تھے۔ نجمہ نکہت کے آباء واجداد کا تعلق بادشاہ جہانگیر کے سلسلے سے چلا آرہا ہے۔ ان کے دادا سید حسین اترپردیش لکھنو میں رجسٹرار ہائی کورٹ تھے۔ ان کے والد سید سراج الحسن بھی وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ان کی والدہ زیب النساء بیگم دین دار خاتون تھیں۔ نجمہ نکہت 24 مئی 1936 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کے بزرگوں نے ان کا نام چاندنی بیگم رکھا اور والدین نے جیلانی بیگم رکھا۔ جب نجمہ نکہت پندرہ سال کی ہوئیں تو انھوں نے اپنی مرضی سے اپنا نام جیلانی بیگم سے بدل کر نجمہ نکہت رکھا۔ ان کی پہلی تصنیف ''وہ راتیں'' کے نام سے افسانہ ماہنامہ ''جادو'' میں شائع ہوئی۔ اس رسالے کو کوثر چاندپوری نکالتے تھے. نجمہ نکہت بچپن ہی سے ذہین تھیں۔ انھوں نے 15 برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا اور ان کے افسانے قومی اور بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہونے لگے تو خوشی کی انتہا نہ رہی اس سے ان کا حوصلہ بلند ہوا، لکھنے کا ذوق بڑھتا گیا کئی ایڈیٹر اور مصنفوں کے خطوط نے انھیں لکھنے پر مجبور کردیا۔ اس بارے میں ان کے بھائی ڈاکٹر حامد حسین لکھتے ہیں کہ:

''جیلانی بیگم جب تیرہ چودہ سال کی تھی تو ایک دن کسی اخبار کا تراشا لیے میرے پاس آئی جس میں ایک چھوٹی سی

خوبصورت کہانی چھپی تھی۔ جسے کسی نجمہ نکہت نے لکھا تھا۔ جب میں نے کہانی نویس کے متعلق پوچھا تو اس نے ہلکے سے کہا ''جی یہ میں ہوں'' اس طرح ادبی دنیا کے لیے وہ نجمہ نکہت ہوگئی لیکن خاندان کے ہر فرد کے لیے وہ صرف چاند تھی جو تاحیات اپنی چاندنی بکھیرتی خود ہی کہیں غائب ہوگئی۔''

نجمہ نکہت کو بچپن ہی سے تعلیم کا شوق تھا. ان کی ابتدائی تعلیم مفید الانام کوٹلہ علی جاہ حیدرآباد میں ہوئی۔ عربی اور اردو کی تعلیم گھر پر ہوئی وہ پڑھنے میں ذہین اور سمجھدار تھیں۔ میٹرک کے امتحان کے وقت نجمہ نکہت نہایت ہی بیمار ہوگئیں تب ان کے بھائی ڈاکٹر حامد حسین نے ایک ٹیوٹر کو گھر میں رکھ کر تعلیم دلوائی۔ نجمہ نکہت نے پی یو سی تک کی تعلیم پرائیویٹ حاصل کی۔ نجمہ نکہت کی ملاقات لکھنؤ کے بہت بڑے رئیس جاگیردار شیخ احمد حسین قدوائی سے ہوئی اور یہ ملاقات محبت میں تبدیل ہوگئی فروری 1935 کو شادی ہوئی۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت خوشحال تھی لیکن ورنگل سے آتے آتے ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ نجمہ نکہت نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے اور ازدواجی زندگی کے نشیب وفراز ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ نجمہ نکہت کا اولین افسانوی مجموعہ ''سیب کا درخت'' ہے اور غیر مطبوعہ گیارہ افسانے ہیں۔ مجموعہ سیب کا درخت پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ (1) کھنڈر (2) سایہ (3) پھتر اور کونپل (4) دو ٹکے کی (5) اس رہگزر پر (6) آخری حویلی (7) ایرکنڈیشنر (8) پھر وہی صبح پھر وہی شام (9) سیب کا درخت (10) شبنم اور انگارے (11) وہ دونوں (12) سیکنڈ ہینڈ (13) دھندلے نقوش (14) ریشمی قمیص (15) درد میں افسانہ ''دو ٹکے کی'' موضوع کے اعتبار سے عورت کی سماجی حیثیت اور اس کی بے بسی کی کہانی ہے۔ نجمہ نکہت نے جاگیردارانہ نظام میں عورتوں کی زندگی، طرزِ معاشرت اور مسائل کی تصویر کشی جس انداز میں کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ اس افسانے کی نمائندگی ندا کرتی ہے۔

''ندا کے ماں باپ بچپن میں گزر جاتے ہیں۔ جب ماں کے گذرنے کے بعد چاچی پُرسے کے لیے دیہات سے آتی ہے تو کپڑے تو کپڑے برتن اور ضروری اور اچھے سامان کے ساتھ ندا کو بھی لے جاتی ہے۔ سارے گھر کا کام دن رات ندا سے لیتی اوپر سے طعنے دیتی کہ اگر تجھ کو گھر سے اُٹھانہ لاتی تو جانے تو کہاں ہوتی۔''

افسانہ کھنڈر میں بتایا گیا ہے کہ حشمت جہاں جو اس کہانی کا کردار ہے اس کی زندگی ایک شاہانہ انداز سے گذر رہی تھی لیکن بعد میں وہ ایک بوسیدہ دیوڑھی کی گری ہوئی دیواروں کی طرح ایک کھنڈر میں تبدیل ہوگئی۔ افسانے کا پلاٹ حیدرآباد کے زوال پذیر جاگیردارانہ نظام اور ایک وسیع محل کے نمائندہ خاندان اور اس کے درمیان کی آویزش اور کشمکش پر مبنی ہے۔ حشمت جہاں اس خاندان کی سربراہ ہے وہ ماضی کی یاد سے اپنی ویران زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اپنی زندگی سنوارنے کی ہر ممکنہ کوشش کرتی ہے۔ حشمت جہاں کا کردار نامساعد حالات سے سمجھوتہ اور ناگوار حقائق سے عبارت ہے۔ وہ اپنے ہی گھر میں خادم کی طرح زندگی گزارتی ہے وہ اس کھنڈر میں ایک کٹھ پتلی کی مانند ہے جو اپنے درمیان ایک توازن قائم کرتی ہے اور اپنی زندگی سے اس قدر بے زار ہوچکی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی سے سمجھوتہ کرتی ہے اور شکست میں ہی وہ اپنی فتح سمجھتی ہے۔ جب کہ وہ اپنے گھر میں خود اکیلی ہے۔ حالانکہ یہاں سب کچھ اس کا اپنا ہوتے ہوئے بھی پرایا ہے۔ کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا کہ جسے وہ اپنا کہہ سکے۔

اس افسانے کا بیشتر حصہ زوال پذیر جاگیردارانہ نظام پر مشتمل ہے۔ پلاٹ بے حد مربوط ہے۔ جس میں واقعات کی ترتیب ان کا ارتقاء و انجام ہے۔ نجمہ نکہت کے کچھ افسانوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوچکے ہیں اور مختلف رسائل میں شائع ہوچکے ہیں جن میں اہم صبا ایوان چراغ شاہراہ دہلی، آندھراپردیش، حیدرآباد، ادب لطیف لاہور دوشیزہ کراچی وغیرہ ہیں۔ ان کے مجموعے ''سیب کا درخت'' کو اردو اکیڈمی آندھراپردیش کی جانب سے ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کا دائرہ بہت بڑا ہے۔ ان کے تمام تر افسانوں میں جذبے کی شدت ہے۔ نجمہ نکہت نے عورتوں کی تعلیم وتربیت، خانگی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کو اپنے قلم کا موضوع بنایا۔ افسانوں کا ذکر کریں تو خواتین افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ نجمہ نکہت کے موضوعات کا کینوس وسیع ہے جو چیز نجمہ نکہت کو دوسرے افسانہ نگاروں سے منفرد کرتی ہے وہ یہ کہ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار، واقعات اور مناظر سب سے پہلے قاری کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جدید افسانوں کی صف میں ان کا مقام الگ ہے۔

نجمہ نکہت نے موضوعاتی اور فنی وتکنیکی ہر طرح سے افسانہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ 'سائے' ان کا ایسا افسانہ ہے جس میں زندگی کی حقیقت، تجربہ اور سبق آموز نصیحت ہے جس میں صبر کا پھل میٹھا ثابت ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک خواتین کے لیے خصوصاً افسانہ نگار خواتین کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ ان کے افسانوں نے جدید ادب کے ناقدین کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ نجمہ نکہت نے اپنے افسانوں میں

ماضی اور حال کے رشتے کو تلاش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ٹوٹتی ہوئی قدریں، بدلتے معاشرے میں خاندانوں کی زبوحالی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو نجمہ نکہت کے تمام افسانے متاثر کن، دلچسپ اور نصیحت آمیز ہیں۔ اس میں نفسیاتی مشاہدہ موجود ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنی شناخت برقرار رکھی ہے۔ اپنے فن سے خود کو ادب میں روشناس کروایا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کی دنیا میں نجمہ نکہت کا ایک مقام ہے انہوں نے اپنے قلم پر اپنی مضبوط گرفت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں جاگیرداری میں استحصال کا شکار ہونے والے کرداروں کے حالات، نفسیاتی، پیچیدگیاں معاشی پستی، اخلاقی گراوٹ اور زندگی کا کرب ملتا ہے۔ اس نظام کے اختتامی کرب کو نہایت عبرت انگیز طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد نئی نسل کی جدوجہد، طوفان سے ابھرنے کی کیفیت، پرانی ذہنیت کے خطرناک پہلو، نیک اور اچھے مقاصد کے پیچھے کام کرنے والی جاگیردارانہ پالیسی کو بلاجھجک افسانہ کھنڈر پیش کیا گیا ہے۔ سماجی مسائل کا عکس بھی ان کے افسانوں میں ابھرتا ہے۔

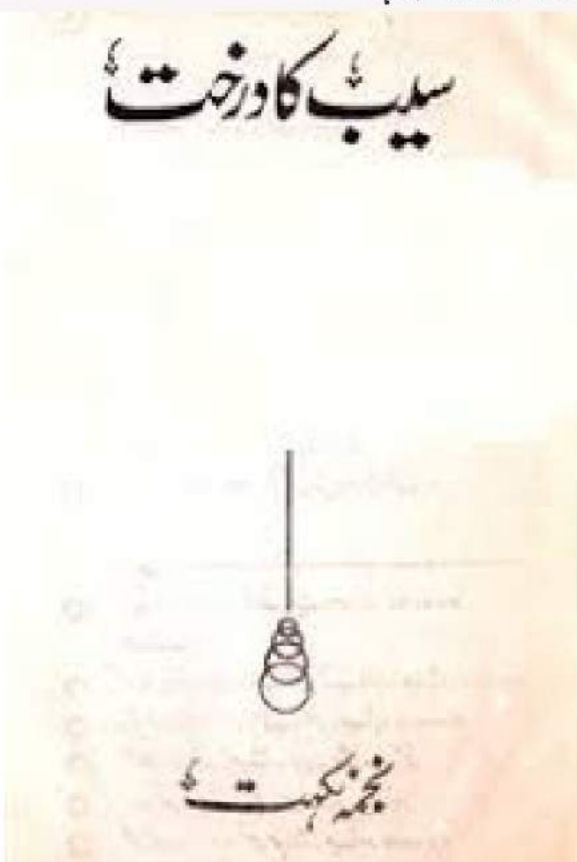

نجمہ نکہت اردو کے نسائی ادب میں فکشن کے حوالے سے بہت بلند

مقام پر نظر آتی ہے اور یہ مقام انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر حاصل کیا۔ ان کے افسانوں کا جائزہ لیں تو نجمہ نکہت نے کبھی اپنے آپ کو کمزور نہیں سمجھا بلکہ اسے اپنی تخلیقی قوت بنایا۔ وہ تاحیات اپنی زندگی میں بہت مصروف رہیں۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر تنہائی میں خود سے مکالمہ کرنے والی ضرورتیں نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار میں سماجی اور مذہبی خدمت کا پرجوش جذبہ پایا جاتا ہے۔ نجمہ نکہت کا ذہن تخلیقی ذہن تھا۔

نجمہ نکہت دکن کی ایک منفرد افسانہ نگار تھیں۔ وہ اعلیٰ قدر اوصاف کی حامل تھیں۔ ملنسار خوش گفتار، تنہائی پسند اور سادگی پسند۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماج میں ہونے والے ظلم وستم، فرقہ پرستی، اوہام پرستی کے خلاف احتجاج کیا۔ انھوں نے سماج کو ان برائیوں سے پاک کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے انھوں نے اپنے قلم کو ذریعہ بنایا۔ نجمہ نکہت کو اپنے فن سے والہانہ محبت تھی وہ پورے خلوص سے لکھتی تھیں۔ جن مسائل کو وہ محسوس کرتی تھیں اس کا گہرائی سے اپنے افسانوں میں ذکر کرتی تھیں۔ چونکہ ان کو اپنے شوہر کے ساتھ گاؤں میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا اس لیے ان کے بیشتر افسانوں میں گاؤں کے کھیت کھلیانیں، فصلیں جھرنیں، نہریں آب وہوا کا خوبصورت بیان ملتا ہے۔ گاوں کے لوگوں کا نفسیاتی جائزہ بھی انھوں نے فنکاری سے پیش کیا ہے۔ نجمہ نکہت کو مناظر قدرت سے فطری لگاؤ تھا اس لیے ان کے افسانوں میں نیچرل منظر نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورا منظر قارئین کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔

نجمہ نکہت کو 19 اگست کو قلب کا دورہ پڑا۔ انھیں جب اسپتال میں لے جایا گیا تو آخری وقت میں بھی ان میں کام کرنے کا عزم وحوصلہ تھا۔ علالت کے وقت جب وہ اسپتال میں شریک ہوئیں تو ضروریات کی چیزیں کم اور کتابیں زیادہ رکھوادیں اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں رہوں یا نہ رہوں دوسرا افسانوی مجموعہ شائع کروادینا۔ ان میں شاید اور کچھ لکھ کر اضافہ کر کے شائع کروانے کی تمنا باقی تھی مگر وقت کے ہاتھوں انسان مجبور، لاچار و بےبس ہوجاتا ہے۔

□□□

Nehan Noorain
H. NO:10 - 6-74
Kisan Nagar
Karim Nagar-505001 (Telangana)
Mob: 9032643273

شاعرات کے منتخب اشعار

وہ بھیڑ تھی کہ ردا اپنی لٹ بھی سکتی تھی
خوشا کہ سامنے زنداں کا در دکھائی دیا

میں نعرہ زن تھی ترے ظلم کے خلاف مگر
ہزار شکر کہ لہجہ مرا نسائی تھا

رفیعہ شبنم عابدی

پھر یاد کے زینے پہ اک آہٹ سی ہوئی ہے
سوچوں کے دریچوں میں کوئی آن کھڑا ہے

خواب آنکھوں میں نظر میں رنگ بھر جاتی تھی جو
کچھ دنوں سے گھر میں وہ پاگل ہوا آتی نہیں

صدیقہ شبنم

کیا کریں ہم بھاگ کے خود سے جدھر جاتے ہیں
ہر قدم پہ کوئی آئینہ پڑا پاتے ہیں

مری تہوں میں بھی پتھر ملیں گے دفن بہت
اگر کبھی کوئی طوفاں ابال دے مجھ کو

وفا لکھنوی

میں بکھر چکی ہوں پھر بھی مری آرزو یہی تھی
ترا نام جس جگہ ہے وہیں میرا نام ہوتا

ہم تری سنگ دلی سے بھی نہیں ہیں مایوس
لوگ کہتے ہیں کہ پتھر میں خدا ہوتا ہے

مظفرالنساء ناز

آرزو جینے کی ہے تو جی چٹانوں کی طرح
ورنہ پتے کی طرح تجھ کو ہوا لے جائے گی

تشنگی میں امتیاز گلشن و صحرا کے
چل پڑیں گے جس طرف ہم کو گھٹا لے جائے گی

سیدہ شان معراج

یہ تصور ہے تری انجمن آرائی کا
میری تنہائی بھی آباد ہے محفل کی طرح

حسرت دید سلامت کہ مری آنکھوں میں
جب بھی چاہوں تری تصویر نظر آئے گی

سیما نظمی

اک یاد کی خوشبو سے مہکی مری تنہائی
تم نے تو جدا ہوکر کی اور مسیحائی

ہمیں نے عشق سے مہکائی دنیا
ہمیں دنیا کو دیوانے لگے ہیں

مسعودہ حیات

مجھی پہ ختم ہوئیں دوست داریاں ساری
کہ میرے درد کا دامن بہت کشادہ تھا

طے کرو اپنا سفر تنہائیوں کی چھاؤں میں
بھیڑ میں کوئی تمہیں کیوں راستہ دینے لگا

نور جہاں ثروت

سعدیہ صدف

اردو غزل میں رنگِ حنا کا حسن

خواتین کو سجنا سورنا بے حد پسند ہے۔ اس کے لیے امتیازِ رنگ کی کوئی قید نہیں ۔ میک اپ سے حسن میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے اور کچھ خواتین کا بہترین Make over ہو جاتا ہے۔ جہاں خواتین آرائشِ حسن کے لیے مختلف طرح کی cosmetics کا استعمال کرتی ہیں وہیں حسن کو چار چاند لگانے میں حنا بھی معاونت کرتی ہے جسے عام طور پر لوگ مہندی بھی کہتے ہیں۔ مہندی لگانا اور لگوانا سب کو پسند ہے۔ پہلے پہل مہندی کا استعمال صرف شادی بیاہ اور تہواروں کے موقع پر ہی کیا جاتا تھا۔ جدید دور میں مہندی فیشن کی علامت بن چکی ہے ۔ اس کی روایت صدیوں پرانی ہے اور اس روایت کا سلسلہ رہتی دنیا تک دراز رہے گا۔ صنف نازک کی جلد چاہے جیسی بھی ہو سبھی خواتین اپنی ہتھیلیوں پر مہندی رچاتی ہیں ۔ حنا بندی کی یہ رسم نہ صرف ہماری تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے بلکہ دیگر قوموں کی بھی تہذیب و تمدن کا اٹوٹ حصہ ہے۔ جہاں نہ صرف شادیوں میں اس کا استعمال ناگزیر ہے بلکہ اسے اچھا شگون بھی سمجھا جاتا ہے۔

حنا بندی ایک قدیم فن ہے جس کی ابتداء کے متعلق ماہرین میں کافی اختلاف رہا، لیکن اس بات کی وضاحت مصر کی ممیوں کے جسم سے ملتی ہے ۔ جن کے ناخن و زلف سرخی مائل یا بھورے رنگ کے ہوتے تھے۔ ماہرین نباتات کا ماننا ہے کہ مہندی کی کاشت سب سے پہلے مصر میں ہوئی اور وہیں سے مہندی کا قلم ہندوستان منگوایا گیا۔ یعنی 700 قبل مسیح سے مہندی ہمارے ملک میں باقاعدہ ہاتھوں ، پیروں اور زلفوں کو رنگین بنانے کے لیے مستعمل ہونے لگی۔ اس کا سائنٹفک نام Lawsomia Inermis ہے۔ اس کے استعمال سے جہاں ہاتھ پیر دلکش اور جاذب نظر دکھائی دیتے ہیں وہیں بالوں میں اسے لگانے سے بالوں کو قدرتی توانائی، دلکشی، ریشمی پن اور خوبصورت رنگ حاصل ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بھی ثابت ہے کہ طبی مقاصد کے تحت بھی مہندی کا استعمال مجرد تصور کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی مریض کے تکیے میں اگر مہندی کے پتے رکھ دیے جائیں تو اسے سکون کی نیند آتی ہے اور بڑی راحت ملتی ہے۔ بالوں کی

طرح کپڑوں اور چمڑوں کو رنگا جاتا تھا۔ ساتھ ہی گھوڑوں کی ایال اور دیگر پرندوں کے روؤں کو بھی مہندی کی مدد سے رنگا جاتا تھا۔

برصغیر میں مہندی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر مغرب کی خواتین نے بھی اس کا استعمال شروع کردیا ہے۔ مغرب میں اس فن کو مقبول بنانے میں ہماری فلمی صنعت کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ جس میں اکثر شادی بیاہ کا منظر فلمایا گیا تو مہندی والی رات کا منظر بھی گیتوں کے ساتھ انتہائی خوبصورتی سے پردۂ سیمیں پر پیش کیا گیا۔ ہمارے یہاں اسے ہر قوم و مذہب کی خواتین استعمال کرتی ہیں۔ اس حنابندی سے شادیوں کی زینت دوبالا ہوجاتی ہے۔

مختلف علاقوں میں مہندی کا استعمال بھی مختلف طرح سے ہوتا ہے۔ مثلاً افغانستان کی خواتین عمر رسیدگی کی علامت کے طور پر مہندی کا استعمال کرتی ہیں۔ آسام میں شادی بیاہ کے علاوہ کنواری لڑکیاں Rongali Bihu کے موقع پر اسے شوق سے لگاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہماری ریاست بنگال میں خواتین لال رنگ جسے mahur / alta کہتے ہیں، سے اپنے پیروں کو رنگتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ شریک سفر جس قدر محبت کرتا ہے مہندی اتنی ہی زیادہ رنگ لاتی ہے۔ خیر اس میں کتنی سچائی ہے یہ تو ہم نہیں بتاسکتے۔ البتہ اب مہندی میں کیمیکل ودیگر قدرتی تیل کا استعمال کیا جانے لگا ہے، جس سے مہندی کے رنگ میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے۔ بعض اوقات خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے، تب ہم کہتے ہیں کہ مہندی اچھی نہیں ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ بازاروں میں بدلتے وقت کے ساتھ مہندی بھی کئی اقسام کی دستیاب ہوئیں۔ مثلاً:

پہلے پہل مہندی کے پودے سے پتے توڑ کر لائے جاتے اور اسے سل بٹے میں پیس کر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طریقے سے پیستے ہوئے ہی ہاتھ رنگین ہوجاتے تھے۔ یعنی مہندی کی لالی ہاتھوں پر چڑھ جاتی۔ دیہی علاقوں میں آج بھی اسی طریقے سے مہندی لگانے کا چلن برقرار ہے۔ اس طرح خالص مہندی کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ بازار میں دستیاب کیمیکل ملی ہوئی مہندیوں کے مقابلے زیادہ گہرا رنگ لاتی ہے۔ اب تو مہندی لگانے کے طریقے بھی بدل چکے ہیں۔ پہلے پہل جہاں روایتی طرز پر مہندی لگائی جاتی تھی وہیں اب مختلف طرح کے ڈیزائن کے ساتھ مہندی رچانے کا فیشن عام ہوگیا ہے۔ مہندی کے ڈیزائن بھی الگ الگ ہیں مثلاً عربی، ہندوستانی، پاکستانی، ڈیزائن۔ اب تو اس طریقے میں اور بھی تبدیلیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اب بازار میں دلہن مہندی، راجستھانی مہندی کے نام سے بھی مختلف طرح کے ڈیزائن انٹرنیٹ اور کتابوں میں بآسانی دستیاب ہیں۔

بدلتے وقت کے ساتھ مہندی کے استعمال کے طریقے بھی بدلتے جارہے ہیں۔ درختوں سے توڑنے اور پیس کر استعمال کرنے کا رواج آہستہ آہستہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ کیوں کہ مختلف کمپنیوں نے پیکٹ میں refine مہندی فروخت کرنا شروع کردیا ہے، جس کا استعمال سر میں یعنی بالوں کو رنگنے کے لیے کیا جانے لگا۔ گرچہ یہ خالص مہندی پاؤڈر نہیں ہوتا بلکہ اس میں کچھ کیمیائی اجزاء بھی شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اس مہندی میں الگ سے کچھ بھی ملانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس پیکٹ میں دیے گئے ہدایت پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرز پر cone والی مہندی ہوتی ہے۔ یہ بھی تکونی پیکٹ میں پیسٹ کی صورت میں ملتی ہے جسے بآسانی کبھی بھی کہیں بھی لے جاسکتے ہیں اور استعمال کرسکتے ہیں۔ اس کی مدد سے اپنے پسند کا مطلوبہ ڈیزائن بھی بنانا آسان ہوگیا ہے۔

کچھ عرصے قبل بازار میں glitter والی مہندی بھی دستیاب تھی۔ اس میں حنا تو نام کو ہوتی تھی۔ مگر اس میں جو نقشہ بنا ہوتا تھا اس میں مختلف رنگوں کے برادے چسپاں ہوتے تھے۔ جن کو کراسن تیل کی مدد سے ہاتھوں پر اتارا جاتا تھا۔ اور یہ مہندی tattoo کی صورت میں ہاتھوں پر لگ جاتی تھی۔ افسوس اسے خاطر خواہ ترقی حاصل نہ ہوسکی۔ لیکن آج بھی یہ مہندی کچھ دکانوں میں دستیاب ہے۔

کچھ عرصے قبل مہندی کی ایک نئی قسم نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ جسے ہم chinese مہندی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ گذشتہ برس اس سے جلد میں ہونے والے منفی مسئلے کی وجہ سے اس کی خرید و فروخت پر پابندی لگادی گئی۔ اس مہندی کی خاصیت یہ تھی کہ اس سے چند منٹوں میں ہی مطلوبہ نتائج فراہم ہوجاتے تھے اور کام کرتے ہوئے اس کی رنگت بآسانی کم ہوتی چلی جاتی تھی۔ دراصل اس قسم کی مہندی میں حنا کے عنصر کم اور alta زیادہ شامل ہوتا۔ یہ سبز، سرخ، بھورے، کالے اور گلابی رنگوں میں ملا کرتا تھا۔

پرانے زمانے میں جب کہ پتے پیس کر مہندی لگائی جاتی تھی اس زمانے میں ہندو خواتین گودنا گوداتی تھیں۔ یہ مہندی نہیں تھی مگر اسی طرز پر اس فن کے ذریعہ ہاتھوں میں گردن پر پشت پر پیٹ میں، کمر پر گودنے گودائے جاتے اور نام بھی لکھے جاتے تھے۔ اس کا نقش تاعمر سلامت رہتا تھا۔ اسی طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ کئی برس پہلے tattoo بنوانے کا بہت زوردار فیشن چل پڑا تھا۔ لڑکے کچھ زیادہ ہی اس کے دیوانے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر ایک لڑکا فلمی اداکاروں کی پیروی کرنے پر ایک

دوسرے کو مات دے رہا تھا۔لڑکوں کے اس فیشن سے مرعوب ہوکر لڑکیاں بھی اس کو اپنے جسم پر بنوانے لگی تھیں۔حالاں کہ یہ جلد کے لیے نقصان دہ عمل تھا۔لہٰذا اس کا رجحان دھیرے دھیرے کم ہوتا جارہا ہے۔

مہندی کی خوشبو ہر کس وناکس کو بھاتی ہے۔اس کی خوشبو ہی ایسی ہے کہ ہر کسی کو اپنی جانب مائل کرنے اور اپنا گرویدہ بنانے پر مجبور کردیتی ہے۔اس کا چلن اب اتنا عام ہوگیا ہے کہ خواتین اب نہ صرف مہندی کا فن سیکھنے لگی ہیں بلکہ کسب فن کے بعد اب اسے اپنی آمدنی کا ذریعہ بھی بنالیا ہے۔اب ہر شاپنگ مال یا بیوٹی پارلرز میں مہندی لگانے والی خواتین موجود ہوتی ہیں جو بھاری رقم لے کر پسندیدہ ڈیزائن سے آپ کے ہاتھوں کو سجانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہیں۔

اس سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ادباء وشعراء بھی مہندی کے اثر سے خود کو بچا نہیں سکے۔انہوں نے ذکر حنا سے اپنے فن کو مزین کرنے کی خوبصورت کوشش کی ہے۔کبھی عبرت،کبھی قربانی،کبھی خوشی کے پیرائے میں مہندی کو استعمال کیا۔محبوب کا حسن تو اپنی جگہ ہے،ہی اس پر مہندی اپنے اندر بلا کی قیامت رکھتی ہے۔کہیں شعراء نے اسے اپنے خون جگر سے تعبیر کیا ہے تو کہیں مہندی لگے پیروں کو مجبوری سے تعبیر کیا ہے۔اس وقت بنگال کے مست کلکتوی کا یہ مشہور شعر بے ساختہ یاد آتا ہے:

سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

اسی طرح اردو نظم کے بابا نظیر اکبرآبادی جنھیں ایک مدت تک اردو شاعری کے نادریافت جزیرے کی حیثیت حاصل رہی۔ان کے پاس لفظوں کا ذخیرہ ہوا کرتا تھا۔جس سے انھوں نے نہ صرف نظموں میں لفظوں کا میلہ لگایا دیا بلکہ قدیم علوم وفنون رسم ورواج کو بھی محفوظ کردیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

کفوں میں،انگلیوں میں،لعل لب میں،چشمِ مئے گوں میں
حنا آفت،ستم فندق،مسی جادو،فسوں کاجل

قدیم زمانے میں شعرانے اپنے معشوق کو بڑا ظالم بتایا ہے اور اس کا اعتراف اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔معشوق کی بے وفائی، اس کا ہرجائی پن، اس کی بے توجہی، رقیب کے ساتھ اس کی دوستی، یہ سارے موضوعات اپنے وقت کی شاعری کی روداد بنے ہوئے تھے۔ذیل کے اشعار سے اس بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔اس سلسلے میں میرتقی میر کے یہ اشعار سماعت فرمائیں جن میں شاعر کہتا ہے کہ مہندی کا رنگ تو طائر کی مثل اڑ جاتا ہے لیکن معشوق کے ہاتھوں سے دل نہیں چھوٹتا۔گویا وہ دل دینا ہی نہیں چاہتا۔جبکہ دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ جب کفِ محبوب سے رہائی ممکن نہیں تو بھلا اس کے ہاتھوں سے مہندی کا رنگ کیا چھوٹے:

طائر رنگِ حنا کی سی طرح
دل نہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹا گیا
کفِ جاناں سے کیا امکاں رہائی میر کوئی ہو
اچنبھا ہے جو اُس کے ہاتھ سے رنگِ حنا چھوٹے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے یہ دوشعر اس ضمن میں ملاحظہ کریں جس میں شاعر نے اپنے خون سے مہندی کے شجر کے پیدا ہونے کی بات کی ہے تو دوسرے شعر میں محبوب کے ہاتھوں میں لگی مہندی کے پکے رنگ کو اپنے خون سے تشبیہ دی ہے:

کشتۂ رنگِ حنا ہوں میں عجب اس کا کیا
کہ میری خاک سے مہندی کا شجر پیدا ہو
مہندی کے دھوکے مت رہ ظالم، نگاہ کر تو
خون میرا دست و پا سے تیرے لپٹ رہا ہے

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں محبوب کی انگشت حنائی کا ذکر کیا گیا ہے:

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا
خون ہے دل خاک میں احوال بتاں پر، یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

مصحفی کے شاگرد خواجہ حیدر علی آتش جو غالب وناسخ کے ہمعصر تھے ان کا یہ شعر دیکھیں جو محبوب پرستی کا شعر ہے۔جس میں شاعر کہتا ہے کہ اس کے محبوب نے جیسے ہی مہندی لگانے کی خواہش کی، مہندی کے سوکھے درخت شاداب ہوگئے۔

مہندی لگانے کو جو خیال آیا آپ کو
سوکھے ہوئے درخت حنا کے ہرے ہوئے

ریاض خیرآبادی نے مندرجہ ذیل اشعار میں محبوب کی نازکی کا ذکر کیا ہے تو دوسرے میں محبوب کی دلکش مہندی کا ذکر کیا ہے جس پہ وہ دل نکال کے رکھ دینے کو تیار ہیں:

اللہ رے نازکی کہ جواب سلام میں
ہاتھ اس کا اٹھ کے رہ گیا مہندی کے بوجھ سے
مہندی لگا کے بیٹھے ہیں کچھ اس ادا سے وہ
مٹھی میں اُن کی دے دے کوئی دل نکال کے

اب یہ چنچل شعر آپ کی سماعتوں کی نذر ہے جس میں بھرپور رومانیت کا رنگ شامل ہے۔اس شعر کے خالق ہیں عاصی غازی پوری شعر ملاحظہ کریں:

لبِ نازک کے بوسے لوں تو مسی منہ بناتی ہے
کفِ پا کو اگر چوموں تو مہندی رنگ لاتی ہے

اب چند ایسے اشعار پیش خدمت ہیں جن میں ناکامیٔ عشق کا فسانہ درج ہے۔ ان اشعار میں مہندی راحتِ جاں نہیں بلکہ زحمتِ جاں اور مجبوری کے زمرے میں شامل ہے:

مہندی نے غضب دونوں طرف آگ لگا دی
تلووں میں اُدھر اور اِدھر دل میں لگا دی
(نامعلوم)

مل رہے ہیں وہ اپنے گھر مہندی
ہم یہاں ایڑیاں رگڑتے ہیں
(مادھورام جوہر)

دونوں کا ملنا مشکل ہے دونوں ہیں مجبور بہت
اس کے پاؤں میں مہندی لگی ہے میرے پاؤں میں چھالے ہیں
(عمیق حنفی)

مرزا ظفری مصحفی کی طرح معشوق کے رنگِ حنا کو عاشقوں کے خون سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم گنہ گاروں کے کیا خون کا پھیکا تھا رنگ
مہندی کس واسطے ہاتھوں پہ رچائی پیارے

بات مہندی کی ہو یا کچھ اور، شاعرہ کا شعر نہ پیش کیا جائے تو بڑی بددیانتی ہوگی۔نسوانی جذبات سے لبریز پروین شاکر کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

گلابی پاؤں مرے چمپئی بنانے کو
کسی نے صحن میں مہندی کی باڑ اُگائی ہو

کشور ناہید کا یہ شعر بھی خوب ہے جس میں ملاقات کی خواہش کسی عورت کے دل میں کیا آگ لگاتی ہے، پر مہندی لگے ہاتھ کیوں کر اس کے پیروں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں:

دل میں ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

ملاحظہ کریں وزیر علی صبا لکھنوی کا یہ بہترین شعر جس میں بہترین منظر کشی کی گئی ہے:

تو اپنے پاؤں کی مہندی چھڑا کے دے اے مہر
فلک کو چاہئے غازہ رخ قمر کے لیے

ذیل کے چند اشعار میں شعرا نے مہندی کے رنگ کو اپنے خون سے تعبیر کیا ہے:

میرے سرخ لہو سے چمکی کتنی ہاتھوں میں مہندی
شہر میں جس دن قتل ہوا میں، عید منائی لوگوں نے
(بہادر شاہ ظفر)

ہمارے قتل سے قاتل کو تجربہ یہ ہوا
لہو لہو بھی ہے مہندی بھی ہے شراب بھی ہے
(کلیم عاجز)

مہندی مرے لہو کی مبارک ہو آپ کو
رنگِ حنا ہے اس میں اور بوئے وفا بھی ہے
(نامعلوم)

جذبۂ عشق سے سرشار عصر حاضر کے شاعر فراغ روہوی کا یہ اشعار ملاحظہ کریں:

سبھی حروف معطر ہوئے، منور بھی
جو تو نے دستِ حنائی سے چھو لیا کاغذ
چلو پردیس سے گھر لوٹ جائیں
صدا رنگِ حنائی دے رہا ہے
(فراغ روہوی)

ہے یاسمین کی خوشبو تمھاری زلفوں میں
کہ دست ناز پہ بوئے حنا کا پہرا ہے
(افتخار راغب)

سامعین کرام یہ تھا اردو شاعری میں رنگ حنا کا ایک مختصر جائزہ۔یہ جائزہ مکمل تو نہیں اس پر مزید تحقیق و گفتگو کی ضرورت ہے۔ناچیز کی یہ ایک ادنیٰ کوشش ہے۔جس میں مہندی کی تاریخ،اس کی روایت اور اس کی مقبولیت ماضی تا حال دکھاتے ہوئے اردو شاعری سے اس کے ڈانڈے ملانے کی ایک کوشش کی گئی۔امید ہے آپ کو پسند آیا ہوگا۔

□□□

Sadia Sadaf
67,Maulana Shaukat Ali Street
Kolkata-700073 (W.B)
mob:9831365693

فردوسہ اختر

صنف نازک

علم وادب سے خودمختاری تک

ہر معاشرے، ریاست اور قوم میں بہت سے طبقات وافراد اپنے بنیادی حقوق سے محروم دکھائی دیتے ہیں۔ان کی زندگی غربت اور کسمپرسی میں گزرتی ہے۔ ایسے لوگوں کا استحصال بھی خوب ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے اندر اپنے حقوق کے تئیں آگہی کا فقدان نظر آتا ہے۔معاشرے کے ایسے طبقات وافراد میں خواتین سر فہرست ہیں۔ حالانکہ خواتین معاشرے کا نصف اور اہم ترین حصہ ہیں۔ ان کے بغیر کسی بھی سماج، ملک اور قوم کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ دنیا کی رنگارنگی اور خوبصورتی ان کے وجود سے ہی قائم ہے۔اسی لیے اقبال جیسے شاعر کو بھی کہنا پڑا تھا ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''۔ایک اور بات جو بہت زیادہ اہمیت کی حامل نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ خواتین خاندان اور معاشرے کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں، نئی نسلوں کے تخلیقی عمل سے لے کر ان کی پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت تک ان کا حصہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا مگر اس کے باوجود ان کے ساتھ جو معاملات پیش آتے ہیں اور جس طرح انھیں نظرانداز کیا جاتا ہے، وہ نہایت تشویشناک امر ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ موجودہ عہد میں بھی عورت کے مسائل اپنی جگہ برقرار ہیں۔ جب کہ اس عہد کو ترقی یافتہ کہا جاتا ہے اور حقوق نسواں اور مساوات کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ حقوق نسواں اور حقوق انساں سے متعلق بہت سی تنظیمیں اور جماعتیں خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم ہیں اور انھیں مسائل ومصائب کے بھنور سے نکال کر ترقی کی دوڑ میں شامل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تنظیمیں خواتین پر ہونے والے مظالم کو سامنے لاتی ہیں، ان کی ضرورتوں کو بیان کرتی ہیں اور معاشرے میں ان کی حیثیت کو مستحکم

کرنے پرزور دیتی ہیں، نیز ان کو بااختیار بنانے کے لیے امکانات بھی تلاش کرتی ہیں۔

خواتین کے مسائل سے عوام الناس کو واقف کرانے اور خواتین کے تئیں جذبۂ ہمدردی پیدا کرنے کے لیے جو کردار ادبی شخصیات نے ادا کیا ہے، اسے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان کے ادب میں عورتوں کے حقوق کی بازیافت کی بات بہت عرصے سے کی جارہی ہے۔ ادبا و شعرا اپنی تخلیقات میں عورت پر ہونے والے ظلم کی کہانیوں کو متاثر کن انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اگر ہم اس حوالے سے صرف اردو ادب کی بات کریں تو اردو کے بے شمار افسانوں، ناولوں، ڈراموں ،اور نظموں وغزلوں میں عورت کے مسائل کا جا بجا بیان ہمیں ملتا ہے۔ اردو کا پہلا ناول 'مراۃ العروس' میں بھی عورت کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ اردو کے نہایت مشہور اور مقبول ناول 'امراو جان ادا' میں بھی عورت کے حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند، کرشن چند، منٹو اور بیدی سب کے افسانوں اور ناولوں میں عورت کی مجبوری ولاچاری کی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ اردو شاعروں نے بھی عورت کو محرومیت اور مظلومیت کے دائرے سے باہر نکالنے کی، معاشرے کو ان کے تعلق سے جھنجھوڑنے اور خود انھیں اپنے حقوق کے لیے بیدار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ مجاز نے تو اپنی بعض نظموں میں عورت کو انقلاب سے ہم آہنگ ہونے تک کی تلقین کر ڈالی ہے۔ کیونکہ وہ عورت کی طاقت، اور اس کی صلاحیتوں کو بخوبی جانتے تھے۔ انھوں نے کہا:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

گویا کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے عورت کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینے اور مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ عورت انقلاباتِ زمانہ سے بھی ہم آہنگ ہوسکے، ملک وقوم کے لیے بھی اپنی خدمات پیش کرسکے، خود اپنی لڑائی بھی لڑ سکے، اسے معاشرے میں مساویانہ حقوق بھی حاصل ہوں، اسے عزت وتکریم کے لائق بھی سمجھا جائے ،اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، اور اسے بااختیار بھی بنایا جاسکے۔

خواتین کو آگے لانے کے لیے ماضی میں بھی بہت سی کوششیں کی گئیں اور حال میں بھی کی جارہی ہیں، خواتین کے تحفظ اور ان کے استحکام کے حوالے سے بہت سے قوانین عہد رفتہ میں بھی بنائے گئے اور اب بھی بنائے جارہے ہیں، لیکن ان قوانین اور کوششوں کا جو نتیجہ ظاہر ہونا چاہیے تھا وہ ابھی تک سامنے نہیں آسکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے سماج میں خواتین آج بھی بعض بنیادی حقوق سے محروم نظر آتی ہیں، جو حقوق ہمارے آئین نے انھیں عطا کیے ہیں، عملی طور پر بہت سی خواتین ابھی تک حاصل نہیں کرپائی ہیں۔ ایسے میں اس نقطہ پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ عورت کو کس طرح مضبوط پوزیشن میں لایا جائے، اس حوالے سے بہت سے ماہرین اس نتیجے پر پہنچتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جب تک عورت کو بااختیار نہیں بنایا جائے گا، اس وقت تک نہ وہ مضبوط ہوسکے گی، نہ اپنے حقوق حاصل کرسکے گی، نہ مظلومیت کے حصار سے باہر آسکے گی، اور نہ ترقی کی راہوں میں رواں دواں ہوسکے گی۔

عورت کو خودمختار بنانے کے لیے حالیہ برسوں میں اس بات پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے کہ عورت کو معاشی سطح پر مضبوط کیا جائے، انھیں اپنی معاشیات قائم کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں، انھیں ملازمتیں دی جائیں، وغیرہ۔ عورت کو بااختیار بنانے کے لیے ماہرین نے بہت سے میدانوں اور شعبوں کی نشاندہی کی ہے، تاہم ان میں عورت کی خودمختاری کے لیے جو میدان زیادہ استوار، محفوظ اور پروقار دکھائی دیتا ہے، وہ علم وادب ہے۔ دنیا کی مختلف قوموں اور طبقوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس کے پاس تعلیم ہے، وہ ترقی کے میدان میں سب سے آگے ہے، اس میں نہ کسی ملک وقوم کی تخصیص ہے اور نہ کسی طبقے یا فرد کی تخصیص۔ جو بھی تعلیم یافتہ ہوتا ہے، اس کے لیے زندگی کی بہت سی راہیں کشادہ ہوجاتی ہیں۔ اس قاعدے کے تحت اگر عورتوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنادیا جائے تو ان کی ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کا عملی نتیجہ سامنے بھی آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ آج خواتین تعلیم حاصل کررہی ہیں اور مختلف میدانوں وشعبوں میں داخل ہورہی ہیں۔ تعلیم اور ان کی صلاحیت کی وجہ سے ان کے لیے آگے بڑھنا آسان ہوتا جارہا ہے، چنانچہ سائنس، میڈیکل سائنس میں بھی وہ مقام حاصل کررہی ہیں۔ آج خواتین ڈاکٹروں کی بہت بڑی تعداد ہے اور میڈیکل سے وابستہ زیادہ تر خواتین برسرروزگار اور خودمختار ہیں۔ اسی طرح تدریسی میدان میں بھی خواتین نے اپنی حیثیت کو تسلیم کرایا ہے۔ بہت سی خواتین ٹیچر ہیں، بلکہ اگر ہم نرسری اور پرائمری سطح کے اسکولوں کا جائزہ لیں تو ان کی کامیابی کے پیچھے یہی خواتین ٹیچر دکھائی دیتی ہیں۔ کیونکہ بچے کی نفسیات کو وہ بہتر سمجھتی ہیں اور ان کے پڑھانے کا انداز بھی ملائم اور پُراثر ہوتا ہے۔ بات صرف پرائمری یا ثانوی اسکولوں تک نہیں بلکہ آج ہمیں ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی خاصی تعداد میں خواتین اساتذہ نظر آتی ہیں۔ بہت سی خواتین اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو

خواتین بھی ان مقامات پر فائز ہیں، انھیں مردوں سے کم نہیں کہا جاسکتا۔ ایسی خواتین مستحکم اور بااختیار ہوتی ہیں۔ گویا کہ علم وادب نے بہت سی عورتوں کو خودمختار بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ آج لڑکیاں تعلیم کے میدان میں لڑکوں سے پیچھے نظر نہیں آتیں بلکہ بعض مقامات پر دو قدم آگے دکھائی دیتی ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ بہت سی مرتبہ وہ امتحانات کے نتائج میں بھی لڑکوں سے زیادہ نمبرات حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ یہ دراصل اس لیے ممکن ہو پارہا ہے کہ آج کی لڑکیوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ وہ لائبریریوں اور کلاسوں میں بھی اپنی موجودگی درج کرارہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آگے چل کر تعلیم کے میدان میں ان کی حصہ داری میں اضافہ ہوگا، آگے چل کر وہ اور بھی زیادہ بڑی تعداد میں ٹیچر اور پروفیسر بنیں گی۔ مختلف علوم وفنون میں بھی ان کو مہارت حاصل ہوگی۔ وہ اچھی ادیبہ، شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار، قانون داں بھی بنیں گی اور جیسے جیسے ان شعبوں میں ان کی تعداد بڑھتی جائے گی، ویسے ویسے ان کی خودمختاری میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

مذکورہ بحث کے حوالے سے اگر ہم علم وادب کے آئینہ میں عورت کی خودمختاری کی بات کریں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سماج میں خواتین کو بااختیار بنانے کا سب سے اہم اور موثر ذریعہ تعلیم ہے۔ یہ صرف ایک فرد کی شخصیت کی نشوونما تک محدود نہیں ہے بلکہ معاشی، سماجی اور ثقافتی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لیے یونیسکو نے عمر، جنس، نسل یا سماجی اور معاشی حیثیت میں کسی بھی طرح کے فرق کے بغیر لڑکیوں کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ 'تعلیم' لڑکیوں کو ان کی سماجی، معاشی اور خاندانی زندگیوں میں زیادہ سے زیادہ بااختیار بنانے کا موقع مہیا کرتی ہے۔ یونیسکو جیسے اداروں نے دیہی علاقوں میں خواتین کی تعلیم کے لیے بھی کوششیں کی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں زیادہ تر خواتین کو اس حق سے محروم رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے اور انھیں گھریلو ذمہ داریوں تلے دبا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ تعلیم کی کمی کا عورتوں اور بچوں کی صحت وتندرستی پر بھی شدید اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان میں بچوں کی صحت کی خرابی کی ایک بڑی وجہ عورتوں کا تعلیم یافتہ نہ ہونا ہے۔ کیونکہ بے پڑھی لکھی مائیں اپنے بچوں کی نہ صحیح طرح سے دیکھ بھال کرپاتی ہیں اور نہ ہی بچے کے بیمار ہونے کی صورت میں ان کا ٹھیک سے علاج کراپاتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کی تعلیم نہ صرف اس کے حق میں بہتر ثابت ہوتی ہے بلکہ اس کے بچوں کے لیے بھی بہت فائدہ مند ہے۔

لہٰذا خواتین کو بااختیار بنانے کے حوالے سے تعلیم کی اہمیت کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ ہمیں سپر پاور بننے کے لیے زیادہ تر توجہ خواتین کی تعلیم پر مرکوز کرنی ہوگی۔ ہندوستان تبھی ایک ترقی یافتہ ملک بن سکتا ہے جب خواتین اپنی صلاحیت اور قابلیت کا بہترین مظاہرہ کریں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور بااختیار ہوں۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خواتین کو بااختیار ہونا چاہیے اور انھیں بااختیار بنانے کے جو بھی مثبت راستے ہیں، انھیں اپنانا چاہیے، البتہ زیادہ زور علم وادب پر دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ علم وادب کے ذریعے خواتین نسبتاً آسانی سے سماج میں اپنی حیثیت تسلیم کراسکتی ہیں۔ وہ ایک اچھی ٹیچر بن کر اپنی عزت وتوقیر کی راہیں استوار کرسکتی ہیں۔ ادب کے میدان میں وہ کمال حاصل کرکے خواتین کے لیے اور زیادہ موثر کن انداز میں آواز بلند کرسکتی ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مرد شاعروں اور ادیبوں نے عورت کے مسائل کو اٹھایا ہے اور ان کے حق میں آواز بلند کی ہے، مگر عورت اپنے خود کے مسائل کو غالباً زیادہ بہتر انداز میں پیش کرسکتی ہے۔ اسی لیے ہمیں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، رشید جہاں جیسی خواتین کے ذریعے لکھے گئے تخلیقی ادب میں کچھ اور ہی بات نظر آتی ہے۔ اسی طرح بہت سی خواتین شاعرات نے بڑی خوش اسلوبی سے عورت کے دکھ، درد، کرب اور مسائل کو پیش کیا ہے۔ ادب کے میدان میں آنے والی بہت سی خواتین نسائی ادب خلق کرکے عورت کی حیثیت کو مستحکم کرنے اور انھیں بااختیار بنانے کے لیے عمدہ کوششیں کررہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ قلم کی اپنی ایک تاثیر ہوتی ہے۔ جو کام تلوار نہیں کرتی، وہ قلم کردیتا ہے۔ اس لیے خواتین کے ہاتھوں میں قلم کا آنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اسی قلم کے ذریعے وہ بہترین ادب بھی خلق کرسکیں گی، اپنے حقوق کی لڑائی بھی لڑسکیں گی اور بااختیار بھی بن سکیں گی۔

□□□

Firdoosa Akhtar
D/o. Abdul Ahad Wani
R/o: Wani Mohalla
House No. 88
Zasow Tahab Pulwama,
District: Pulwama-192301 (J & K)
Mobile No.: 7006047451

خوشبو پروین

رباعی کا خالص شاعر
عادل اسیر دہلوی

عادل اسیر دہلوی کی پیدائش 12/ستمبر 1959 کو دہلی میں ہوئی۔ان کا پورانام عادل رشید تھا۔ انھوں نے اردو سے ایم۔اے کیا۔اس کے بعد تعلیم کے پیشے سے ہی منسلک ہوگئے۔تصنیف وتالیف اور ترجمہ ان کا خاص میدان رہا۔انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔جن میں ''ہمارے سائنس داں، بچوں کی رباعیاں، جھوٹ مت بولو، پھولوں کی مالا، گلدستۂ نعمت، بچوں کے دوہے، بیربل کی کہانیاں اور آسان نظمیں وغیرہ ہیں۔ان کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف پوری اردو دنیا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی متعدد اکادمیوں نے انھیں اعزاز واکرام سے نوازا۔یوں بھی دہلی ایک ایسا شہر ہے جو ہمیشہ علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔اردو کے ارتقا کا تعلق دہلی سے اتنا گہرا ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری کی کون سی ایسی صنف سخن ہے جس کا تعلق دہلی سے نہ ہو۔رباعی بھی ایک ایسی ہی صنف سخن ہے جو شروع سے اب تک دہلی میں کہی جارہی ہے۔رباعی کو بھی نشیب تو کبھی فراز کا سامنا کرنا پڑا۔اکثر وبیشتر شعرا نے منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے رباعی کہی لیکن انہی میں سے ایک ایسا شاعر بھی دہلی میں نمودار ہوا جس نے رباعی کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔شروع شروع میں ان کا علم ادب اطفال کی جانب مائل ہوا اور تاعمر اس میں اپنی شناخت قائم رکھی۔

رباعی کی خدمات میں ان کا ایک مجموعہ'رباعیات عادل' ہے اور ایک مستزاد کا مجموعہ'رباعیات مستزاد' کے نام سے ہے جس میں 16 شعراء قدیم کی اردو فارسی رباعیاں شامل ہیں۔ان کے علاوہ ''نغمۂ

خیام، رباعیات دارا شکوہ، رباعیات غنی کشمیری، رباعیات سیف الدین باخرزی کے نام سے کتابیں ترتیب دی ہیں۔ محض اتنا ہی نہیں کہ انھوں نے ان رباعیوں کو ترتیب دے کر اشاعت کروائی ہے بلکہ ان کا اہم کام یہ ہے کہ انھوں نے ان رباعیات کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

رباعیات عادل (2008) ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں ان کی 87 رباعیاں شامل ہیں۔ان کے یہاں اخلاق و نصیحت، مذہب، درد و غم، عشق و محبت وغیرہ کے عنوان کے تحت رباعیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے الفاظ کی بازی گری اور شعبدہ بازی کے بجائے آسان اور سہل زبان کا استعمال کیا ہے۔

عشق کا موضوع اردو شاعری میں مرکزیت کا حامل ہے۔غزل میں عشقیہ مضامین کو نہایت خوبی سے برتا جا رہا ہے۔ رباعی میں بھی یہ موضوع کبھی عشق حقیقی کی شکل میں تو کبھی عشق مجازی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔عادل اسیر دہلوی کی رباعیوں میں بھی عشق حقیقی اور عشق مجازی کی آنکھ مچولی نظر آتی ہے:

جب رات میں ہوتا ہے ہجر کا دھوکا
خاشاک پہ ہوتا ہے شرر کا دھوکا
آنکھوں نے مری وہ حسن بھی دیکھا ہے
سب جس کو سمجھتے ہیں نظر کا دھوکا

☆

تقدیر کی سازش ہے کوئی کھیل نہیں
ہر وقت کی کاوش ہے کوئی کھیل نہیں
پروانہ بنا شمع بھی جل جاتا ہے
یہ عشق کی آتش ہے کوئی کھیل نہیں

☆

کیا دوسرا خورشید فلک پر چھایا
دنیا میں اندھیرا نہ کہیں ہے سایا
اک صبح درخشاں مرے گھر میں آئی
یہ کون بدل کر نئے کپڑے آیا

☆

حل ہوں وہ سوالات کہاں تھے بابا
سر ہوں وہ محلات کہاں تھے بابا
اس نے بھی وفا کا نہ کوئی پاس کیا
میرے بھی یہ حالات کہاں تھے بابا

ابتدائی دور میں رباعی کے موضوعات محدود تھے لیکن امجد حیدرآبادی، میر انیس، مرزا دبیر اور جوش و فراق نے اس کو وسعت دی اور عروج بخشا۔ بعدازاں رباعی کے موضوعات میں رنگارنگی اور تنوع کا سلسلہ شروع ہوا اور زندگی کے بیشتر موضوعات پر رباعیاں لکھی گئیں۔آج رباعی کا فن موضوعاتی اعتبار سے اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ انسانی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی باتوں کا ذکر اور اس کے ماحول سے وابستہ تمام چیزوں کا عکس رباعی میں دیکھا جا سکتا ہے۔عادل اسیر نے بھی رباعی کو موضوعاتی وسعت دی ہے۔ان کی چند رباعیاں دیکھیے:

الفت بھی گوارا نہیں میرے دل کو
نفرت بھی گوارا نہیں میرے دل کو
عزت بھی گوارا نہیں میرے دل کو
ذلت بھی گوارا نہیں میرے دل کو

☆

جلووں کی فراوانی نہیں جاتی ہے
بڑھتی ہے یہ حیرانی نہیں جاتی ہے
اس طرح کسی کو میں نے دیکھا عادل
صورت کوئی پہچانی نہیں جاتی ہے

☆

کاہل کو بھی پرجوش بنا دیتا ہے
دیوانے کو باہوش بنا دیتا ہے
انداز مخاطبت کسی کا عادل
مجھ کو ہمہ تن گوش بنا دیتا ہے

انسان زندگی کے تجربات سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔اپنے مشاہدات سے وہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات سے عبرت حاصل کرتا ہے اور ان پر عمل کر کے اپنی زندگی کو سجاتا ہے، سنوارتا ہے۔رباعی میں اخلاقی و اصلاحی پہلو اور عبرت وغیرہ کے موضوعات پر ہر شاعر نے خصوصیت سے طبع آزمائی کی ہے۔ عادل اسیر دہلوی نے بھی ان موضوعات پر بہت عمدہ رباعیاں کہی ہیں۔زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں جن کو ہمارے لیے بہت ضروری بنایا گیا ہے انھیں عادل اسیر نے اپنی رباعیوں میں بڑے سہل انداز میں پیش کر کے انسان کی رہنمائی کی کوشش کی ہے۔چند رباعیاں دیکھیے:

جب خواب نہ دیکھوگے تو کیسی تعبیر
جب رنگ نہ ہوگا تو کہاں کی تصویر

جب آج نہ بنیاد رکھوگے عادل
کل کس طرح دیوار کروگے تعمیر

☆

نیکی میں کسی کی بھی نہ تحریف کرو
ہو لائق توصیف تو توصیف کرو
احباب کی عادل نہ برائی کرنا
دشمن بھی جو اچھا ہو تو تعریف کرو

☆

دانائی تو غصے کی ہے اک ادنیٰ کنیز
ہیں ہوش و خرد بھی یہاں بیکار سی چیز
ہوجاتا ہے غصے میں جنونی انسان
پھر نیک یا بد کی نہیں رہتی ہے تمیز

عادل اسیر کا رباعی گوئی کے سلسلے میں ایک منفرد کارنامہ 'بچوں کی رباعیاں' ہے جس کے وہ شاید موجد ہیں۔اس تعلق سے ان کی رباعیوں کے تین مجموعے 'بچوں کی رباعیاں'، پھول ہی پھول' اور 'رنگ برنگ پھول' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ان تینوں مجموعوں میں صرف بچوں کی مناسبت سے رباعیوں کو شامل کیا گیا ہے، جن کو دیکھ کر بڑے بڑے شاعر حیران رہ گئے اور بچوں نے خوب پسند کیا۔ان کی بیشتر رباعیوں میں بچوں کی نفسیات، پسند ناپسند، کھیل تماشے، روزہ، نماز، تعلیم، اخلاق، استاد، کتاب اور والدین کی تعظیم کو موضوع بنا کر بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔بچوں کو نصیحت بھی کی گئی ہے اور برے کاموں سے روکنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔چند رباعیاں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

اسکول میں بچہ کہ جو ہوگا معصوم
استاد کو ہوگا وہی پیار معلوم
عزت جو کروگے ہوگے عالم
گستاخ سدا دیکھا علم سے محروم

☆

نادانی سے ہوجائے خطا عیب نہیں
مل جائے کوئی اس پہ سزا عیب نہیں
تعلیم سے بڑھ کر نہیں خوبی کوئی
دنیا میں جہالت سے بڑا عیب نہیں

☆

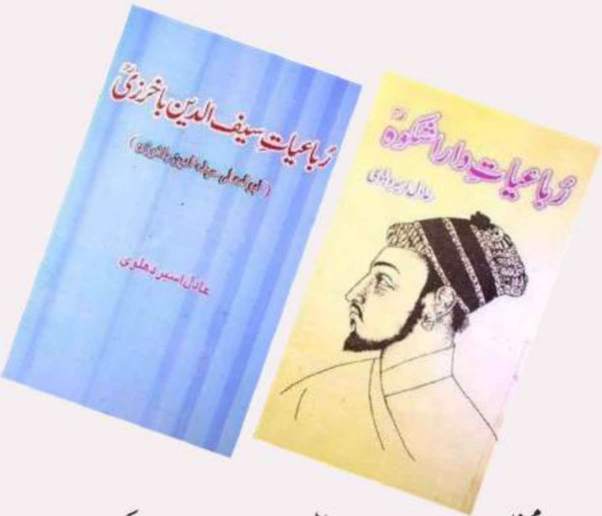

محفل میں جو بیٹھو تو سلیقہ سیکھو
باتیں بھی کرو مگر قرینہ سیکھو
ہر حال میں ملحوظ رہیں کچھ آداب
احباب سے ملنے کا طریقہ سیکھو

☆

دادی نے نصیحت یہ سنائی اک دن
کیا بات ہے پتے کی یہ بتائی اک دن
نیکی کبھی بیکار نہیں جاتی ہے
آتی ہے بڑے کام بھلائی اک دن

مذکورہ بالا رباعیاں جو بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں ان میں کسی خاص انتخاب کا خیال نہیں رکھا گیا۔میرے خیال سے عادل اسیر کی تمام رباعیاں خود ایک انتخاب ہیں۔جس کا اندازہ قاری کو مطالعے کے بعد ہی ہو پائے گا۔

الغرض عادل اسیر دہلوی نے اردو رباعی کے لیے کئی جہت سے عمدہ کام کیا۔ان کی نظر میں فارسی کی اہم رباعیاں تھیں۔اسی نوعیت کی رباعیاں خود بھی کہی ہیں۔اگر زندگی وفا کرتی تو ہمارے سامنے ان کی متنوع تخلیقات ہوتیں لیکن افسوس 2014 میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور رباعی کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔

❑❑❑

Khushboo Perween
K-2 Third Floor,Haji Colony
Ghaffar Manzil, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mo-7644096273
E-Mail: khushboolkr93@gmail.com

ڈاکٹر عرشیہ جبین

محمدی بیگم کی ادبی و صحافتی خدمات

محمدی بیگم اردو کی اولین خاتون صحافی تھیں۔ ان کی زیر اشاعت ''تہذیب نسواں'' کا اجرا عمل میں آیا۔ انھوں نے ایک ایسے دور میں جب کہ خواتین کا بے پردہ ہو کر لکھنا پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ نہ صرف اردو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانیں سیکھیں بلکہ اپنے قلم سے کئی اور خواتین میں تعلیمی شعور بیدار کیا اور ان میں مختلف فنون کا ذوق پیدا کیا۔

محمدی بیگم کی ولادت سید شفیع احمد کے گھر 22 مئی 1877 ضلع سرگودھا، شاہ پور میں ہوئی۔ ان کے والد کولونیل ایڈمنسٹریشن کی ریونیو سروس میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر ترقی کرتے ہوئے پہنچے تھے۔ جہاں جہاں ان کے والد کی پوسٹنگ ہوتی تھی۔ وہ ان کے ہمراہ جہلم، بہاول پور، راولپنڈی وغیرہ میں رہیں۔ محمدی بیگم ابھی بہت چھوٹی تھیں ان کی والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا اور ایک پھوپی نے کی تھی۔ ان کے دو بڑے بھائی رفیع اور سمیع اور ایک بہن احمدی بیگم تھیں اور محمدی بیگم اپنے بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھیں۔ بچپن ہی سے محمدی بیگم نہایت سمجھدار اور ذہین واقع ہوئی تھیں۔ آٹھ برس کی عمر میں انھوں نے اپنے چچا سے عربی قاعدہ پڑھنا سیکھا۔ اسی کے ساتھ اردو پڑھنا لکھنا بھی شروع کیا بعد میں اپنے بھائی رفیع سے قرآن کا ناظرہ ایک سال کے عرصے میں سیکھ لیا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ تاش اور کرکٹ وغیرہ بھی کھیلا کرتی تھیں۔ انھیں گڑیوں کے کھیل سے زیادہ دلچسپی سینے پرونے اور مختلف قسم کے پکوان سیکھنے میں تھی۔ اس کے علاوہ انھیں سلائی کڑھائی میں بھی دلچسپی تھی۔ انھوں نے والد سے سلائی مشین منگوا کر باقاعدہ پردے میں رہ کر مرد درزی سے سلائی سیکھی تھی۔ اپنے ایک بڑے بھائی سے انھوں نے انگریزی زبان بھی سیکھی۔

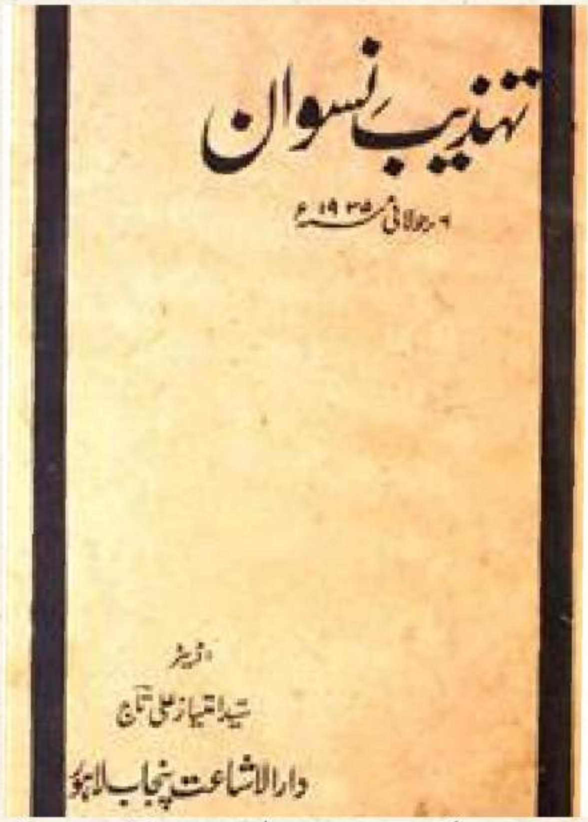

محمدی بیگم کی شادی ان کی سوتیلی ماں کے بھائی یعنی سید ممتاز علی سے نومبر 1897 میں ہوئی۔ سید ذوالفقار علی جوڈیشیل آفیسر کے صاحبزادے تھے۔ جو اتر پردیش ہی کے رہنے والے تھے لیکن ان دنوں پنجاب میں مقیم تھے۔ ممتاز علی دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ بعد میں انھوں نے لاہور میں آگے کی تعلیم حاصل کی اور پنجاب چیف کورٹ میں مترجم کے عہدے پر انھیں ملازمت مل گئی۔ بعد میں انھوں نے یہ ملازمت ترک کردی۔ ان کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد جن کے دو بچے تھے انھوں نے دوسری شادی محمدی بیگم سے کی۔ ممتاز علی کو پڑھنے لکھنے کا ذوق پہلے سے تھا انھوں نے شادی کے بعد رفاہ عام پریس اور دارالاشاعت، پنجاب کے نام سے طباعت کا کام شروع کیا۔ محمدی بیگم کی صلاحیتوں اور ذہانت سے متاثر ہوکر انھوں نے خواتین کا ایک رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ وہ اپنی بیگم کو خواتین کے اس رسالے کی مدیر بنانا چاہتے تھے۔ اس دور کے دستور کے مطابق خواتین کا تعلیم حاصل کرنا اور بے پردہ ہونا معیوب سمجھا جاتا تھا ایسے حالات میں عورتوں کی تربیت اور ان میں اخلاقی بیداری بہت مشکل کام تھا۔ ممتاز علی عورتوں کی پستی اور مظلومیت سے واقف تھے اور ان کی تربیت کی غرض سے یہ رسالہ نکالنا چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے مقصد کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بچپن سے میری تربیت کچھ ایسے حالات میں ہوئی اور اپنے خاندان میں ایسے واقعات پے در پے پیش آئے کہ اس زمانے سے ہی مجھے مظلوم مستورات کے ساتھ ہمدردی ہوگئی اور عمر اور تعلیم کے ساتھ ساتھ میرے دل کا یہ جذبہ بھی قوت پکڑتا گیا۔''

(سید ممتاز علی تہذیب نسواں، (لاہور) 6 جولائی 1918، بیسویں سالگرہ نمبر ص 424)

محمدی بیگم پڑھی لکھی خاتون تھیں ان کی صلاحیت سے ممتاز علی واقف تھے چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ خواتین میں شعور اور بیداری پیدا کرنے کا کام ایک خاتون ہی اچھے طریقے سے کرسکتی ہے چنانچہ اس مقصد کے تحت انھوں نے محمدی بیگم کو انگریزی اور ہندی زبان کی باقاعدہ تعلیم دلائی۔ فارسی اور عربی زبان کی تعلیم وہ خود دیا کرتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ محمدی بیگم اردو، فارسی اور انگریزی سے واقف نہیں تھیں لیکن ایک مدیر کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں اس احساس کے تحت انھوں نے محمدی بیگم کی تربیت شروع کی اور انھوں نے بہت جلد یعنی صرف چار مہینے کے عرصے میں اچھی خاصی لیاقت حاصل کرلی۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''جب پہلی بیوی کے انتقال کے بعد 1897 کے اخیر میں میرا عقد ثانی ہوا اور بیوی پڑھی لکھی اور ذہین ملی، تو جس شوق کی آگ میرے دل میں مدت سے دبی ہوئی سلگ رہی تھی، بھڑک اٹھی اور میں نے اپنے عقد کے چند گھنٹوں کے بعد ہی یہ قصد مصمم کرلیا کہ مستورات میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک اخبار ضرور جاری کیا جائے اور اپنی اہلیہ کو اس کی اڈیٹر بنایا جائے۔ میری بیوی کے لیے یہ کام صرف انوکھا ہی نہیں تھا بلکہ اس نے انہیں کسی قدر فکرمند اور پریشان بھی کردیا لیکن میں نے انھیں یقین دلایا کہ وہ اس کام کے لیے بقدر ضرورت تھوڑے دنوں میں ہی تیار ہوجاویں گی۔ چنانچہ عقد کو ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ میں نے انھیں اس کام کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ خانہ داری کے بار کے علاوہ ان کو چار سبق روزانہ پڑھنے پڑتے تھے۔ ایک میم انہیں انگریزی سکھاتی تھی۔ ایک ہندو لیڈی انہیں ہندی پڑھاتی تھی ایک لڑکا انہیں حساب سکھاتا تھا اور میں انہیں ایک روز عربی اور ایک روز فارسی پڑھاتا تھا۔ اور جو کام

ان سے لینا تھا اس کے متعلق مناسب گفتگو کرتا رہتا تھا۔اس طرح چار مہینے کی رات دن کی محنت سے ہی مجھے امید ہوگئی کہ جوکام ان کے لیے تجویز کیا گیا ہے یہ اسے بخوبی انجام دے سکیں گی۔''

(سید ممتاز علی تہذیب نسواں، (لاہور) 6 جولائی 1918، بیسویں سالگرہ نمبر ص 425)

جب اس رسالے کے لیے محمدی بیگم تیار ہوگئیں ۔تب اس رسالے کا نکالنے کا کام شروع ہوالیکن مارچ 1989 میں اس رسالے کے نام کا انتخاب کرنے کے لیے کئی نام تجویز کیے گئے۔ممتاز علی نے نام کے سلسلے میں سرسید سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا اور انھیں ایک خط لکھا گیا سرسید نے جواب میں لکھا کہ مجوزہ ناموں میں انھیں کوئی نام پسند نہیں آیا اگر اس رسالے کو نکالنا ہی ہے تو اس کا نام ''تہذیب النسواں'' رکھا جانا چاہیے۔ چونکہ یہ نام ان کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' ہی سے ملتا جلتا تھا اس لیے ممتاز علی نے اس نام کو قبول کیا اور جلد ہی یہ نام بہت مقبول بھی ہوالیکن اس کا سہل نام ''تہذیب نسواں'' زیادہ مناسب تھا اس لیے بعد میں یہی رکھا گیا۔اس رسالے کے اغراض ومقاصد میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ یہ رسالہ سرسید کی طرح زیادہ عالمانہ نہ ہو۔کیونکہ خواتین کے مسائل کا بیان اور ان کی تربیت کرنا مقصود تھا اس لیے سہل اور سیدھی سادی زبان کو اپنایا گیا۔

سرسید کی وفات کے تین مہینے بعد یعنی یکم جولائی 1898 کو ''تہذیب نسواں'' کا اجرا عمل میں آیا اور پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ابتدا میں یہ رسالہ مضامین اور شاعری کے ساتھ صرف 8 صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا بعد میں اس میں مزید چار صفحات کا اضافہ عمل میں لایا گیا تاکہ قومی وبین الاقوامی خبریں بھی اس میں شامل کی جاسکیں لیکن شروعات میں اسے زیادہ کامیابی نہیں ملی اور ہر ہفتہ 1000 کاپیاں شائع ہونے کے باوجود صرف 70 خریدار ہی اسے خریدتے تھے۔نمونے کی کاپیاں شمالی ہند کے معروف گھرانوں میں بذریعہ ڈاک بھیجی جاتی تھیں لیکن کئی لوگ اس کے جواب میں مایوس کن باتیں لکھ کر بھیجتے تھے ایسے حالات میں بھی ممتاز علی اور محمدی بیگم نے ہمت نہیں ہاری اور رسالہ کو جاری رکھا 1900 میں اس کی 300 کاپیاں بکنے لگیں،اس کے بعد خریدار کی تعداد بڑھ کر 1901 میں 345، 1902 میں 417 اور 1903 میں 428 ہوگئی۔اس کے بعد اس کے حجم اور مواد میں بھی اضافہ ہوا اور جلد ہی اسے بے پناہ شہرت ملنے لگی اور یہ رسالہ وسیع پیمانے پر پڑھا جانے لگا اور کئی دہوں تک یہ بااثر رسالے کے طور پر جاری رہا۔

ممتاز علی اور محمدی بیگم کے انتقال کے بعد ''تہذیب نسواں'' کی ادارت ممتاز علی کی بیٹی وحیدہ بیگم نے کی۔ان کے انتقال کے بعد ممتاز علی اور محمدی بیگم کے فرزند امتیاز علی تاج نے 1935 میں اس کی ادارت سنبھالی۔یہ رسالہ تقریباً 50 سال تک یعنی 1949 تک جاری رہا۔خواتین کے حقوق اور تعلیمی بیداری میں ''تہذیب نسواں'' نے نہایت اہم رول ادا کیا۔اس رسالے کے ذریعے کئی نامور شخصیات ہمارے سامنے آئیں مثلاً عطیہ بیگم فیضی، زہرہ بیگم، نذر سجاد حیدر یلدرم وغیرہ۔

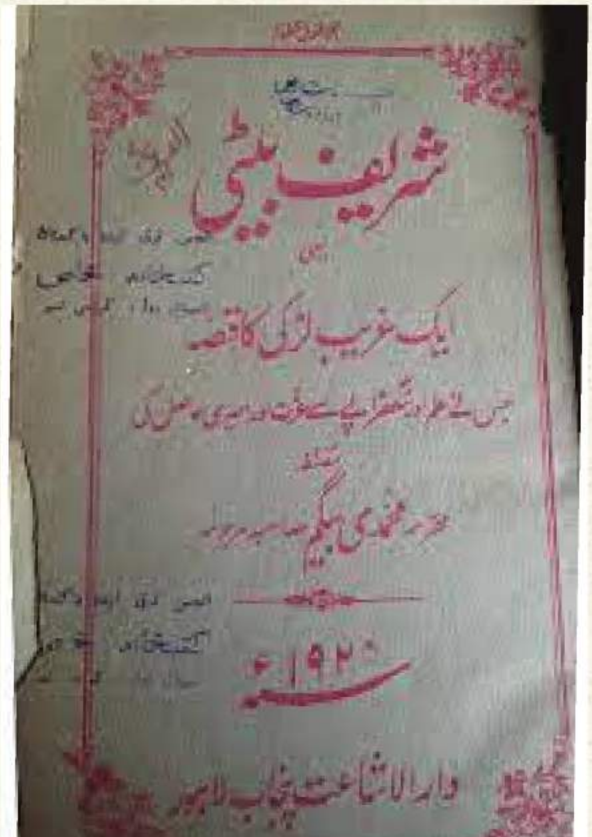

''تہذیب نسواں'' خواتین کا پہلا رسالہ نہیں تھا اس سے پہلے ''اخبار النسا'' (دہلی) اور شریف بیبیاں (لاہور) سے جاری ہوچکے تھے لیکن یہ اس حیثیت سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا کہ یہ وہ پہلا اردو رسالہ تھا جس کی مدیر ایک خاتون تھیں۔

تہذیب نسواں کے جاری ہونے کے چند سال بعد ان کے گھر امتیاز علی تاج کی ولادت ہوئی ۔امتیاز علی تاج کے علاوہ چونکہ ممتاز علی کی پہلی بیوی کے دو بچوں کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد تھی۔محمدی بیگم نے یہ ذمہ داری بخوبی انجام دی۔وہ امتیاز علی تاج کو پیار سے تاج بلاتی تھیں۔ ان کی تربیت کے لیے انھوں نے کہانیاں اور نظمیں بھی لکھیں۔ان کے گیتوں کا ایک مجموعہ ''تاج گیت'' کے عنوان سے شائع ہوا۔انھوں نے

لوریاں بھی بڑی تعداد میں لکھیں جو بعد میں ''خواب راحت'' کے نام سے شائع ہوئیں۔

محمدی بیگم نے ''تہذیب نسواں'' کے لیے بہت سے مضامین، کہانیاں، نظمیں لکھنے کے علاوہ اخلاقی طرز کے ناول بھی لکھے۔ خواتین کے لیے ہدایت ناموں کے طرز پر رہنما کتابیں لکھیں ان کے کام کی تیز رفتاری کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے آٹھ سال کی قلیل مدت میں تقریباً 13 کتابیں تصنیف کیں۔ جس کا اشتہار ان کے رسالے اکتوبر 1907 میں شائع ہوا۔ 1905 میں انھوں نے ایک اور رسالہ ''مشیر مادر'' کے نام سے جاری کیا۔ جس میں نوجوان ماؤں کے مسائل اور بچوں کی تربیت سے متعلق مضامین لکھے جاتے تھے لیکن اس رسالے کو محدود وسائل کی وجہ سے زیادہ خریدار نہیں ملے اور پھر محمدی بیگم کی اپنی گھریلو ذمہ داریاں، بچوں کی نگہداشت اور سماجی وفلاحی خدمات اور تہذیب نسواں کی ذمہ داریوں کی وجہ سے انھیں اتنی مہلت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ اس رسالے کی جانب زیادہ توجہ دیں۔ چنانچہ جلد ہی یہ رسالہ بند ہوگیا اور تہذیب نسواں ہی میں بچوں کی نگہداشت اور تعلیم وتربیت کے لیے ایک گوشہ مختص کردیا گیا۔

انھوں بہ حیثیت مدیرہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے بھی خواتین اور بچوں کے لیے کئی تصانیف لکھیں۔ مثلاً ''امتیاز پچیسی'' بچوں کے لیے 1904 میں لکھی۔ جس میں پچیس چھوٹی نہایت سادہ سلیس کہانیاں بیان کی گئی ہیں جو تین یا چار سال کی عمر کے بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔

''دل پسند کہانیاں'' (1906) دہلی کے شرفا میں چھوٹے بچوں کے لیے جو مشہور کہانیاں ہوا کرتی تھیں انھیں جلی خط میں مع تصاویر شائع کرکے منظر عام پر لایا۔

''علی بابا چالیس چور'' (1915) الف لیلی کی مشہور کہانی بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔

''تین بہنوں کی کہانی'' (1915) الف لیلی کی ایک اور کہانی کو شائع کیا گیا۔

''دلچسپ کہانیاں'' کے عنوان سے انھوں نے 27 کہانیوں کا مجموعہ بچوں کے لیے باتصاویر شائع کیا۔

انھوں نے جو ناول لکھے ان میں صفیہ بیگم، شریف بیٹی اور آج کل اہمیت کے حامل ہیں:

ناول ''صفیہ بیگم'' انھوں نے 1902 میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی بیان کی ہے جو نہایت ناز و نعم میں پرورش پاتی ہے لیکن سماج کے بے ہودہ رسم و رواج کی پابندی کے سبب ماں باپ کی تجویز پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر پاتی اور شدت غم میں شادی کے دن ہی فوت ہوجاتی ہے۔

''شریف بیٹی'' 1908 میں منظر عام پر آئی۔ اس میں ایک چھوٹی سی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کا باپ مر جاتا ہے اور ماں اس صدمے سے پاگل ہوجاتی ہے اور یہ لڑکی اپنی محنت، ریاضت اور ہمت سے اپنے بھائی اور ماں کا خیال رکھتی ہے ماں کا علاج کراتی ہے اور اپنی شرافت، نیکی اور محنت سے امیر بن جاتی ہے۔

''آج کل'' کے عنوان سے 1912 میں خواتین پر ایک ایسی کہانی لکھی ہے جو کسی کام کو آج کی بجائے کل پر ٹالتی رہتی ہیں جنھیں بعد میں خراب نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کہانی کو موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

ان کی ترجمہ کردہ کہانی ''چندن ہار'' ہے، جس میں خواتین کی قرض لینے کی عادت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی اس بری عادت کو چھڑانے کے مقصد سے یہ کہانی لکھی گئی ہے۔ دراصل یہ موپاساں کی مشہور کہانی The Necklace سے ماخوذ کہانی ہے جسے انھوں نے نہایت دلچسپ اور موثر انداز میں لکھا ہے۔

خواتین کے لیے چند ہدایات نامے بھی تحریر کیے ہیں مثلاً:

''رفیق عروس'' (1901) نئی نویلی دلہن کے لیے لکھی گئی تصنیف ہے جس میں خواتین کے دکھ درد، خوشیاں، ناتجربہ کاری میں کام آنے والی نصیحتیں کرتے ہوئے زمانے کے نشیب وفراز سے واقف کرایا گیا ہے۔

''سگھڑ بیٹی'' (1905) کنواری لڑکیوں کے لیے لکھی گئی تصنیف ہے جس میں ہنسی کھیل میں نصیحتیں کی گئی ہیں اور بڑوں کا ادب، خدا کی عبادت، بھائی بہنوں سے محبت، یگانوں اور بیگانوں کے حقوق، علم و ہنر کے فائدے، لکھنے پڑھنے، کھانے پکانے، سینے پرونے اور حفظ صحت وغیرہ سے متعلق طریقے سکھائے گئے ہیں۔

''آداب ملاقات'' (1905) میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں اپنی باہمی ملاقاتوں میں خواتین کو ملنے جلنے کے طریقے اور مہمانوں اور میزبانوں کے قاعدے سکھائے گئے ہیں۔ ایک طرح سے خواتین میں اخلاق وتہذیب وشائستگی کے طور طریقے سکھانے کی غرض سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ محمدی بیگم نے کئی انجمنیں اور ادارے بھی قائم کیے۔اس دور میں جبکہ خواتین پر جو معاشرتی پابندیاں عائد تھیں انھوں نے خواتین کی اصلاح اور ان کی عملی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے1907 میں ''انجمن خاتونانِ ہمدرد'' کا قیام عمل میں لائیں۔اس کے تحت غریب و نادار خواتین کوسلائی اور دستکاری کی تربیت کے علاوہ ان کی ہر ممکنہ مدد کی جاتی تھی،انھیں باعمل بنانے اور فلاح و بہبود کے لیے آمادہ کرنے کی طرف توجہ دی جاتی تھی اور اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ''انجمن تہذیب نسواں'' کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جس کی وہ صدر تھیں اور جس کے تحت خواتین کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جاتا اور ملک بھر سے نامور خواتین اس میں شرکت کرتیں اور اہم موضوعات پر اپنے خیالات پیش کرتیں تھیں۔

ان کی غیر مطبوعہ تصانیف میں لڑکیوں کے لیے: انتخابِ دوادین،رفیق گیسو،حسنہ عباسہ،پھوپھی کی لائف،اخلاق محمدی،بال بیوہ،تربیت اولاد،صادقہ یا صابرہ،سات سہیلی کاجھمکا،یادگار محبوب، رفیق نوشہ، خانہ داری،دل کو نصیحت،رنگوں کی ترکیبیں،لڑکوں کے لیے جمشید،گلدستہ وغیرہ ملتی ہیں۔

1908 میں خواتین کے لیے ان کی نمایاں خدمات کے صلہ میں حکومت پنجاب کی جانب سے ایک توصیفی سند اور تین سو روپے کے انعام سے نوازا گیا۔1908 میں بہت زیادہ کام کرنے اور والد اور بھائی کی موت کے صدموں کی وجہ سے ان کی صحت خراب رہنے لگی۔انھیں صحت یابی کے لیے شملہ بھی لے جایا گیا لیکن وہ صحت یاب نہ ہوسکیں اور 2/نومبر 1908 میں شملہ ہی میں30 سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ان کی تدفین ان کی وصیت کے مطابق لاہور میں عمل میں آئی۔

ان کے فرزند امتیاز علی تاج، محمدی بیگم کی لکھنے کی عادت اور ان کی مصروفیات کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرحومہ کو جب کبھی سوسائٹی میں کوئی بات اصلاح طلب معلوم ہوتی تھی تو وہ گھر آکر فوراً اسے نوٹ کر لیتی تھیں۔اس کی خرابیاں دلاویز قصے کے پیرائے میں بیان کرتی تھیں اور نصیحت کی کڑوی گولی کو افسانے کی شکر میں لپیٹ کر مریضوں کو دیتی تھیں۔ان کے قصوں نے اصلاح معاشرت کا جس قدر عظیم کام کیا ہے اور کتابوں نے اتنا نہیں کیا ہوگا۔اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادھر انہوں نے کوئی تصنیف شروع کی ادھر اسی کے دوران کوئی اور بات انہیں کھٹکی اور ایک اور دلچسپ قصے کا پلاٹ انکے دماغ میں آگیا تو انہوں نے اس پہلی کتاب کو اسی حالت میں چھوڑ کر دوسری لکھنی شروع کردی۔اس طرز عمل سے ان کی بعض کتابیں نا مکمل رہ گئیں لیکن اس وقت مکمل تصانیف کے مسودے بھی اس قدر پڑے ہیں کہ اگر سب کو شائع کیا جائے تو وہ مستورات کی اصلاح وترقی میں بہت قابل قدر مدد کریں۔''

(بحوالہ محمدی بیگم: ایک شعلہ مستعجل، از چودھری محمد نعیم، امروز علی گڑھ، اکتوبر۔دسمبر 2018،ص63)

غرض محمدی بیگم نے اپنی انتہائی قلیل عمر میں بھی بیش بہا خدمات انجام دیں۔خواتین اور بچوں کے لیے کتابیں لکھیں،رسالے نکالے مدیرہ کی ذمہ داری سنبھالی،خواتین کے لیے انجمنیں قائم کیں،غریبوں اور نادار لڑکیوں کو سلائی ودستکاری کا ہنر سکھائے،خواتین کے لیے کانفرنس،خواتین میں تعلیمی بیداری پیدا کی اور ان کی اخلاقی تربیت کی۔غرض محمدی بیگم نے ایک خاتون کی حیثیت سے بچوں اور خواتین کے لیے بے لوث خدمت انجام دیں۔اگر ان کی عمر نے وفا کی ہوتی تو یقیناً وہ اور بھی کئی کام انجام دیتیں۔انھوں نے انتہائی قلیل عمر میں بھی جو کچھ کام کیا وہ قابل ستائش ہے اور اردو صحافت میں پہلی خاتون مدیرہ کا جس طرح حق ادا کیا یہ اور ان کی دیگر خدمات خصوصاً خواتین کی صحافت اور اردو زبان وادب کی انھوں نے اپنی فکر اور اپنے خیالات ونظریات کے ذریعے جس طرح خدمات انجام دیں اسے یقیناً اردو ادب اور صحافت کبھی فراموش نہیں کرسکتا اور بلاشبہ ہم ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی خواتین کی صحافت کی تاریخ رقم کی جائے گی وہ محمدی بیگم کے ذکر کے بغیر ادھوری ہی کہی جائے گی۔

□□□

Dr. Arshia Jabeen
Associate Professor
Dept. of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046 (Telangana)

اردو میں نسائی صحافت

حقانی القاسمی

فیمنزم یعنی تانیثیت کو اس کے مروجہ اصطلاحی مفہوم اور نظری تحریکی تصور کے تناظر میں دیکھا جائے تو اردو میں تانیثی صحافت کا وجود ہی نہیں ہے۔ کیونکہ بہ حیثیت تحریک یا نظریہ تانیثیت کا جو منشور ہے اور جن افکار و تصورات پر یہ مرکوز ہے اردو کی نسائی صحافت کی اس سے قطعی کوئی ذہنی مناسبت اور مطابقت نہیں ہے۔ خاص طور پر ریڈیکل فیمنزم مشرقی تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ فیمنزم کا بنیادی مقصد مرد مرکوزیت کے خلاف محاذ آرائی کے ساتھ مردانہ تحکم، تغلب، تسلط، تفوق کے تصور کو خواتین کے ذہنوں میں نقش کرنا اور عورتوں کی تملیک اور تحکیم کے خیال کو مستحکم کرنا تھا۔ مگر اب وقت نے خود ہی فیمنزم کو فریب اور فراڈ ثابت کر دیا ہے کہ اس تحریک نے تعمیر و ترقی نسواں کی آڑ میں تخریب اور تنزلی کی سازش رچی تھی۔ فیمنزم سے وابستہ خواتین نے بھی فیمنزم کی بہت سی در پردہ حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یمنزم نے خانگی اقدار سے بیگانگی اور تحریک آزادی نسواں کی آڑ میں عورتوں کو مستحکم اور خود مختار بنانے کے نام پر عورتوں کے جسم اور ذہن کی تجارت کی ہے۔ فیمنزم نے عورت کے چہرے اور چرتر کو مکمل طور پر مسخ کر دیا ہے۔

انگریزی میں فیمنزم سے جڑے ہوئے بیشتر رسائل میں عورتوں کے جنسی حظ و نشاط کی افزونی کا مواد ہوتا ہے اور مردوں کی شہوت خیز عریاں تصاویر ہوتی ہیں۔ Play Girl, Curve اور Filament جیسی میگزین میں جنسی تشریق اور ترجیحات پر مبنی آرٹیکلز ہوتے ہیں۔ ان رسائل نے زیادہ تر Cosmo Girl کو جنم دیا ہے۔ ہاں ان رسائل کو پڑھنے سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ عورت صرف مریم نہیں زلیخا بھی ہوتی ہے۔ وہ صرف ستی ساوتری نہیں کرشن چندر کی جولیا کرومی بھی ہوتی ہے۔ انگریزی کے نسائی رسائل کے برعکس اردو کی نسائی صحافت نے نسوانی چہروں اور کرداروں کو نکھارنے اور سنوارنے کا کام کیا ہے۔ عورتوں پر مرکوز جو رسائل، مجلّات، اخبارات، ماضی تا حال شائع ہوئے ہیں ان کے مقاصد اور موضوعات فیمنزم سے بالکل مختلف ہیں کیوں کہ ان مجلّات کی غایتِ

اشاعت صرف اور صرف تعلیم، تربیت اور ترقی نسواں ہے۔ رفیق نسواں (لکھنو)، اخبار النساء (دہلی)، تہذیب نسواں (لاہور)، خاتون (لاہور) شریف بی بی (لاہور)، خاتون (علی گڑھ)، ماہنامہ عصمت (دہلی)، معلم نسواں (حیدر آباد)، النساء (حیدرآباد)، پردۂ عصمت (لکھنو)، سفیر قیصر (میرٹھ)، شمس النہار (دہلی)، پردہ نشین (آگرہ)، خادمہ (حیدر آباد)، سفینۂ نسواں (حیدرآباد)، ہم جولی (حیدرآباد)، نسوانی دنیا (لاہور)، ظل السلطان (بھوپال) بانو (بھوپال)، انیس نسواں (دہلی)، خیابانِ دکن (حیدرآباد)، الحجاب (بھوپال)، امہات (بھوپال)، آفتاب نسواں (بھوپال)، پیام نسواں (لکھنؤ)، تبلیغ نسواں (دہلی)، جوہر نسواں (دہلی)، بنات (دہلی)، استانی (دہلی)، حجاب (رامپور)، بانو (دہلی)، خاتون مشرق (میرٹھ/دہلی)، روشنی (دہلی)، معین نسواں (علی گڑھ)، ماہنامہ حور (کولکاتہ) مومنہ (حیدرآباد)، چراغ کعبہ (ممبئی)، زیور (پٹنہ) قلمکار، باجی (دہلی)، محفل صنم (دہلی) 'خواتین کی دنیا' نئی دہلی، 'خواتین دنیا' (قومی اردو کونسل، نئی دہلی) وغیرہ اہم نسوانی رسائل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے دو جلدوں پر مشتمل 'اردو میں جرائد نسواں' میں تقریباً ڈھائی سو نسائی رسائل کا ذکر کیا ہے۔ ان میں کتنے رسالے نسائی صحافت کے زمرے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تحقیق طلب ہے کیوں کہ صرف زنانہ نام یا خاتون کی ادارت کی وجہ سے نسائی صحافت میں کسی بھی مجلّے کی شمولیت میرے خیال میں محلِ نظر ہے۔ بہت سے علمی و ادبی رسالوں کی ادارت سے خواتین کا تعلق رہا ہے جیسے 'نیا دور' بنگلور سے ممتاز شیریں، ادب لطیف لاہور سے صدیقہ بیگم، مونتاج لاہور سے منصورہ احمد، مستقبل کراچی سے ثمینہ راجہ، آستانہ دہلی سے بیگم ریحانہ فاروقی، 'شعر و حکمت حیدر آباد سے اختر جہاں' 'آواز' پاکستان سے، فہمیدہ ریاض، 'صدا' کشمیر سے، سیدہ نسرین نقاش، 'سب رس' حیدر آباد سے سکینہ بیگم، صبا حیدر آباد سے صفیہ اریب 'سب رنگ نو' لکھنؤ سے، شاہدہ صدیقی، 'بزم ادب' (علی گڑھ) سے راشدہ خلیل، 'زریں شعائیں' بنگلور سے فریدہ رحمت اللہ اور 'بیسویں صدی' نئی دہلی سے شمع افروز زیدی 'فکر و آگہی، بھوپال سے رضیہ حامد 'ریختہ روزن' سے ہما خلیل اور 'حاشیہ' اورنگ آباد سے ڈاکٹر ہاجرہ بانو کا ادارتی رشتہ ہے۔ مگر ان رسائل میں شاید ہی نسائی مسائل، موضوعات و متعلقات پر کوئی نسائی مخاطبہ یا تانیثی ڈسکورس ہوتا ہو، اس لیے یہ ایسے رسائل کو نسائی صحافت میں شامل کرنا شاید موزوں نہیں ہوگا۔ نسائی صحافت میں طبقۂ نسواں کی بھی تخصیص نہیں ہے بلکہ اس میں وہ تمام مرد حضرات بھی شامل ہیں جو خواتین کے مسائل اور موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔

میرے پیش نظر صرف وہ مجلّات ہیں جو خواتین کے مسائل و موضوعات سے مختص ہیں اور جن کے مقاصد میں طبقۂ خواتین کی تعلیم، تعمیر و ترقی اور مستورات کے حقوق کا تحفظ ہی شامل ہیں۔ زیادہ تر نسائی رسائل کے موضوعات اور مقاصد میں یکسانیت ہے۔ نسائی رسائل نے عورتوں سے متعلق جن موضوعات پر ترجیحی طور پر مضامین شائع کئے ہیں ان میں تعلیم نسواں، حقوق نسواں، سماجی مسائل اور مطلقہ خاتون کی فلاح و بہبود، کثیر زوجگی نظام، سخت پردہ، طلاق، خلع، کم عمری کی شادی اور فضول رسمیات سے گریز کے علاوہ امور خانہ داری، کشیدہ کاری، سلائی، کڑھائی، پکوان، اصلاح لباس، زینت و زیبائش، صحت فیشن، دسترخوان، کامیاب عورتوں کی سوانح اور دنیا بھر کی عورتوں سے متعلق خبریں شامل ہیں۔ ان رسائل میں بہتر خانگی زندگی کے نسخے اور امورِ خانہ داری سے متعلق معلومات بھی درج ہوتی تھیں اور عورتوں کو تعلیمی، سماجی اور سیاسی سطح پر بیدار کرنے کا مقصد بھی شامل تھا۔ خاص طور پر لڑکیوں کے لئے اسکول اور مکاتب کے قیام پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ ان رسائل میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی شمولیت ہوتی تھی جس میں خواتین اپنے داخلی اور خارجی جذبات و احساسات کا اظہار بھی کرتی تھیں۔ ان نسائی رسائل نے مردوں کے خلاف کوئی محاذ قائم نہیں کیا نہ مرد اساس معاشرے کے خلاف احتجاج یا بغاوت کا رویہ رہا اور نہ ہی فہمیدہ ریاض کی اقلیما جیسی آواز بلند ہوئی اور نہ ہی امریکی شوسیکس اینڈ دی سٹی جیسی ذہنیت سامنے آئی کیوں کہ اردو میں بیشتر نسائی رسائل کے مرتب یا مدیر مرد حضرات ہی تھے اور ان کا بنیادی مقصد تعلیمی، سماجی اور معاشرتی سطح پر طبقۂ اناث کی بہتری تھا۔ ان رسائل کے ذریعہ عورتوں کی زندگی میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ تغیرات نمایاں ہوئے اور یہ اپنے بنیادی اور شرعی حقوق سے آگاہ ہوئیں۔ نظر بدلی تو منظر بھی بدلا اور خواتین کی تخلیقی قوت کا اعتراف اس مرد معاشرے نے بھی کیا جس نے انھیں ثانوی بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس طرح ان رسائل نے عورتوں کے لیے چلمن سے چاند تک کے سفر کو آسان بنا دیا۔ انہی رسائل کی وجہ سے آج خواتین قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو شاید خواتین کو اتنا مضبوط اور متحرک پلیٹ فارم میسر نہ ہوتا۔ دراصل عورتوں کے امپاورمنٹ میں انہی نسائی رسائل کا اہم اور کلیدی کردار ہے۔

اردو میں نسائی مجلّات کو بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی اور طبقۂ نسواں پر رسائل نے بہت گہرے اثرات بھی مرتب کیے انہی رسالوں کا اثر ہے کہ ایک زمانے میں جو عورتیں والدۂ فلاں، ہمشیرۂ

فلاں، اہلیہٴ فلاں اور بنت فلاں کے نام سے مضامین لکھا کرتی تھیں۔
ان عورتوں نے اپنے نام سے مضامین لکھنے شروع کئے اور اس طرح خاتون قلم کاروں کا ایک کارواں بنتا گیا اور پھر کامرانیوں کی نئی نئی عبارتیں لکھی جانی لگیں۔ خواتین کی کامیابی اور کامرانی کا یہ سارا سہرا تعلیم اور ترقی نسواں کے اُن بنیاد گزاروں کے سر ہے جن میں بیشتر ناموں کی نسبت مرد طبقہ سے ہے۔ مردوں کے ایک بڑے حصے نے صنفی تعصبات سے گریز کرتے ہوئے عورتوں کے لئے یکساں مواقع مہیا کئے اور رسائل کے ذریعہ خواتین کے لئے نیا روزن کھولا، نئے دریچے وا کئے۔ محبوس معاشرے میں محصور خواتین نے آزادی اور عافیت کی سانس لی اور امکانات کی ایک نئی دنیا اُن کے روبرو ہوئی۔ زرخیز نمو کے امکانات روشن ہوئے اور نسائی تخلیقی قوت سورج کی مانند اپنی منزل کی تمام راہوں کو روشن کرتی گئی۔ گو کہ ان رسائل کے مدیران کو مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مگر میرے خیال میں یہ مخالفت مرد معاشرے کی طرف سے نہیں تھی بلکہ جاگیردارانہ نظام کی غلیظ ذہنیت اس کے پس پشت کارفرما تھی۔ 'تہذیب نسواں' کو بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور ماہنامہ 'خاتون' علی گڑھ اور معلم نسواں کو بھی۔ ماہنامہ خاتون کے ایک ایڈیٹوریل میں یہ لکھا گیا کہ 'ہم نے بڑے تعجب سے سنا ہے کہ علی گڑھ کے کسی مولوی نے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد رسالہ خاتون کی مخالفت میں ایک وعظ کہا اور دورانِ واعظ میں اس بات پر زور دیا کہ رسالہ خاتون عورتوں کے حقوق کی وکالت کرتا ہے یہ بالکل خلاف شرع شریف ہے۔'

اداریے میں مزید یہ لکھا گیا ہے کہ 'ہم نے افواہاً سنا ہے کہ علی گڑھ میں خاتون کی مخالفت میں کوئی رسالہ جاری ہوا ہے۔ ہم نہایت خوشی سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔' معلم نسواں حیدرآباد میں جب سخت پردے کے خلاف مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس رسالے کو بھی بند کرنا پڑا مگر ان مخالفتوں کے باوجود بہت سے نسائی رسائل پہاڑ اور چٹان کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور تعلیم و ترقی نسواں کے لیے کوشاں رہے۔ ان ہی رسائل کا فیض ہے کہ عورتوں کے مکاتیب قائم ہوئے اور ان کی تعلیمی راہ کی مشکلات دور ہوئیں اور یہ عورتیں مختلف اصناف ادب میں اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار بھی کرنے لگیں۔

نسائی رسائل میں رفیق نسواں لکھنو کو اولیت کا شرف حاصل ہے کہ اس کی اشاعت کا آغاز 5 مارچ 1884 کو ہوا۔ یہ عیسائی مشنری کا رسالہ تھا۔ اس کے بانی پادری کریون تھے اور مسز ہیڈلی اس کی ایڈیٹر تھیں۔ جنھوں نے ایک اہم بات یہ لکھی تھی کہ 'آپ اس پرچے کا کوئی مضمون اپنے گھر میں ان کو جو پڑھ نہیں سکتیں ہر روز سنایا کیجیے۔'

فرہنگ آصفیہ کے مؤلف اور مشہور لغت نویس مولوی سید احمد دہلوی نے 'اخبار النساء' یکم اگست 1884ء کو دہلی سے شائع کیا۔ یہ رسالہ ایک ماہ میں تین بار شائع ہوتا تھا۔ یہ مکمل طور پر عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ جس میں عورتوں کی تعلیم، حیا اور شرافت سے متعلق تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار کے خلاف بھی محاذ آرائی ہوئی مگر مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی جرأت کا ثبوت دیا اور رسالہ جاری رکھا۔

'پیسہ' کے مدیر منشی محبوب عالم نے مستورات کی تعلیم کے لیے لاہور سے 1893 میں شریف بیبیاں کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور رسالے کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے یہ تحریر کیا کہ 'رسالہ شریف بیبیاں جاری کرنے کی غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے لاکھوں بے زبان مخلوقات (فرقہ نسواں) کی خانہ داری کی تعلیم سے متعلق ایسے امور اس میں درج کیے جایا کریں جس میں صرف ہر ایک گھرانہ بہشت کو نمونہ بن جاوے بلکہ آئندہ نسل کی اٹھان میں بھی اس سے مدد ملے۔' اس مکمل نسائی رسالے میں ممتاز عورتیں، روئے زمین کی عورتیں، انتظام خانہ داری، دسترخوان، تربیت اطفال، آرائش و زیبائش، کشیدہ کاری جیسے عنوانات پر مضامین شائع کیے جاتے تھے۔

دارالاشاعت لاہور کا رسالہ 'تہذیبِ نسواں لاہور' نسائی صحافت کا ایک روشن باب ہے۔ یہ ہندوستان کا سب سے پہلا زنانہ ہفتہ وار اخبار تھا جیسا کہ تہذیب نسواں کے سرورق پر درج ہے۔ سر سید احمد خاں نے یہ اخبار جاری نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی نے یہ اخبار شائع کیا۔ اس کا پہلا شمارہ یکم جولائی 1898 میں منظر عام پر آیا۔ مولوی ممتاز علی کی دوسری بیوی اور ڈراما انار کلی کے مصنف امتیاز علی تاج کی والدہ نعمت خانہ، رفیق عروس، سگھڑ بیٹی، خانہ داری کی مصنفہ محمدی بیگم کی ادارت میں یہ رسالہ شائع ہوا۔ انھوں نے 'مشیر مادر' کے نام سے ایک اور رسالے کی ادارت کی۔

مولوی ممتاز علی حقوق نسواں کے علمبردار تھے۔ انھوں نے حقوق نسواں پر ایک اہم کتاب تحریر کی تھی جس کی وجہ سے انھیں ہندوستان کا پہلا فیمنسٹ بھی کہا جاتا تھا۔ سردار محمدی بیگم نے انھیں نسوانی بیڑے کا نا خدا تو کسی نے انھیں خضر نسواں بھی کہا ہے۔ مولوی ممتاز علی نے نسائی موضوعات پر مرکوز اس رسالے کا اجرا کیا جس کا مقصد مستورات کی تعلیم و تربیت، اخلاق و خانہ داری، حکایات و شکایات کے علاوہ ان کے حقوق سے آگاہ کرنا تھا۔ یہ صرف ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ اس رسالے کی بھی شدید مخالفت ہوئی۔ مولوی سید ممتاز علی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ 'لوگوں کو حق اور اختیار تھا کہ وہ اخبار کو نا پسند کرتے اور نہ پڑھتے اور اپنے گھروں میں نہ آنے دیتے مگر انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ گالیاں دینی شروع کیں۔ گالیاں بھی اگر بند خطوط کے اندر لکھی آتیں تو اس قدر ذلت نہ ہوتی مگر وہ تو اخبار کے پیکٹوں پر بازاری گالیاں لکھ کر اخبار واپس کرتے تھے اور خطوں میں جو کچھ لکھتے تھے کہ وہ اس قدر شرمناک ہوتا تھا کہ خط کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ہاتھ کانپتے اور دل سہا جاتا تھا' (تہذیب نسواں، 6 جولائی 1935) شدید مخالفت کے باوجود یہ رسالہ طویل عرصے تک شائع ہوتا رہا۔ محمدی بیگم کے بعد وحیدہ بیگم بنت سید ممتاز علی اور پھر امتیاز علی تاج نے اس کی ادارت سنبھالی۔ آخری شمارہ 1949 میں شائع ہوا۔ اس رسالے نے بہت سی خواتین قلم کاروں کو جنم دیا۔ جن میں نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی، سلطانہ آصف فیضی، صغرا ہمایوں مرزا، زخ ش قابل ذکر ہیں۔ جن خواتین کی تحریریں تہذیب نسواں میں بکثرت شائع ہوئیں ان میں ظفر جہاں بیگم، بلقیس جمال، نجم النساء، زاہدہ خاتون، خاتون اکرم، کنیز فاطمہ، امۃ الحمید خانم، ممتاز النساء، زہرہ خانم، خدیجہ بائی، خدیجۃ الکبریٰ، محمودہ بیگم، عباسی بیگم، فاطمہ بیگم، اکبری خانم، رحیم النساء، صغیر فاطمہ وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس رسالے میں تعلیم نسواں، امور خانہ داری کے علاوہ، پردہ، پولی گیمی اور طلاق جیسے مسائل پر مضامین اور مباحثے شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے نے نسائی صحافت کو ایک نئی روشنی اور نئی راہ دکھائی۔

علی گڑھ سے پاپا میاں شیخ محمد عبداللہ بی اے، ایل ایل بی اور ان کی بیوی وحیدہ بیگم کی ادارت میں یکم جولائی 1898 کو ماہنامہ 'خاتون' علی گڑھ کا اجرا ہوا۔ یہ دراصل آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تعلیم نسواں کے سیکشن کا ترجمان تھا۔ اس میں تعلیم نسواں کی حمایت میں مضامین شائع ہوتے تھے اور اسی رسالے کی وجہ سے علی گڑھ میں مدرسہ نسواں کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں عبداللہ گرلس کالج کی شکل اختیار کر گیا۔ اس رسالے کی بڑی پذیرائی ہوئی کیوں کہ یہ رسالہ مکمل طور پر مستورات کی تعلیم اور تربیت کے لیے وقف تھا۔

دہلی سے 1908 میں مصور غم علامہ راشد الخیری کی ادارت میں 'ماہنامہ عصمت' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ شریف ہندوستانی بیویوں کے لیے رسالہ تھا۔ اس میں مرد اور خواتین دونوں کی تحریریں ہوتی تھیں۔ اس میں تعدد ازدواج کے خلاف اور عورتوں کی وراثت کے حق میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ راشد الخیری کے بعد رازق الخیری، آمنہ نازلی، صائمہ خیری اور طارق الخیری اور صفورہ خیری کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے مضمون نگاروں میں بہت سی مؤقر شخصیات شامل تھیں۔ دہلی کے بعد یہ رسالہ پاکستان سے شائع ہوتا رہا۔ 1979 تک یہ رسالہ جاری رہا۔ خوب صورت طباعت اور دیدہ زیب سرورق کی وجہ سے یہ رسالہ ہر حلقے میں مقبول تھا۔

معلم نسواں حیدر آباد مولوی محبّ حسین کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ جو کہ حقوق نسواں کے علم بردار تھے اور روشن خیال بھی۔ انھوں نے یہ ماہواری رسالہ اس مقصد کے ساتھ شائع کیا تھا کہ 'مسلمان عورتوں کی موجودہ پست و ذلیل حالت میں

ترقی ہو اور علم و تعلیم کی روشنی پھیلے۔' انھوں نے اشتہار میں بھی اس کی وضاحت کی تھی کہ 'اس کا موضوع عورت ہے جس کی ہر ایک حالت سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کی غایت، ترقی، تعلیم و ترویج نسواں ہے جن کی ملک و ملت کو بہت ضرورت ہے۔' مولوی محبّ حسین نے معلم نسواں میں جن موضوعات پر اپنے مجلّے کو مرکوز رکھا تھا ان میں قدرتی واخلاقی شاعری و نظم نسواں، اخبار نسواں، آداب و اخلاق نسواں، آیات و احادیث نسواں، فقہ و قانون نسواں، انتظام خانہ داری، طب نسواں، آرائش و زیبائش نسواں، عورتوں کے ڈرامے اور ناول، نظائر مقدمات نسواں، تعلیم و تربیت اطفال، پرورش اطفال، مضامین نسواں، مشاہیر نسواں، قصص و حکایات نسواں، وعظ و پند نسواں، تعلیم و تربیت نسواں، مراسلات نسواں، مذاق نسواں اہم ہیں۔ ان تمام موضوعات کی وضاحت انھوں نے اشتہار میں کی ہے اور معلم نسواں میں ان موضوعات پر مضامین بھی شائع کیے گئے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا رواج کے عنوان سے ایک بہت وقیع مضمون بھی تحریر کیا تھا اور اس تعلق سے کئی اور تحریریں بھی انھوں نے شائع کی ہیں۔ مولوی محبّ حسین نے سخت اور غیر شرعی رواجی پردے کی مخالفت میں مضامین بھی شائع کیے جس کی سزا یہ ملی کہ ان کے رسالے کو بند کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ اسی رسالے میں اس نوع کے مصرعے بھی چھپتے تھے کہ ''حامیان پردہ داری مبتلائے جہل ہیں''۔ مولوی محبّ حسین نے اس مجلّے میں 'پردے کی مضرتیں' کے عنوان سے مضامین شائع کیے۔ پردے کے خلاف بہت سی تحریریں انھوں نے شائع کیں۔ مولوی محمد سلیمان بیرسٹر ایٹ لا کا مضمون 'موجودہ پردہ خلاف عقل ہے' کے عنوان سے شائع کیا۔ مولوی محبّ حسین کا خیال تھا کہ 'مسلمان عورتوں کی تعلیم میں پردہ' ایک سخت سنگلاخ پہاڑ کی طرح حائل ہے جب تک اہل ملک اس فولادی کوہ کے کاٹنے کی طرف متوجہ ہوں گے اس وقت تک مسلمان عورتیں صحت و تعلیم دونوں سے محروم رہیں گی اور پھر ان کے اثر سے قومی اخلاق، تہذیب و تمدن بھی درست نہ ہوں گے۔' انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ 'پردہ نے تمام ہندوستانی قوموں کو اور خالصتاً مسلمانوں کو اتنے اور ایسے نقصان پہنچائے جن کی وجہ سے ساری قوم پر تباہی برس گئی۔' مولوی محبّ حسین 'نساء المسلمین کے موجودہ پردے کو عورتوں کے لیے ایک قسم کا حبس دوام قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنے مجلّے میں بحث بھی چھیڑی اور معلم نسواں میں یہ اشتہار شائع کروایا کہ جو حضرات قرآن شریف اور احادیث مقدسہ سے یہ ثابت فرمائیں کہ نساء المسلمین کا موجودہ پردہ جائز ہے تو ان کو سو روپے بطور انعام دیے جائیں گے۔ مولوی صاحب کی مخالفت میں کئی علما و فضلا کی دانشورانہ تحریریں شائع ہوئیں۔ ضرورت ہے کہ معلم نسواں میں پردے کی حمایت یا مخالفت میں چھپنے والی تمام تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تا کہ پردے کے تعلق سے تمام حقائق عوام کے سامنے آسکیں۔

حیدر آباد ہی سے صغرا ہمایوں مرزا حیا ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ لندن کی ادارت میں 'عورتوں اور لڑکیوں کا ماہوار رسالہ'، 'النسا' کا اجرا ہوا۔ یہ انجمن خواتین دکن کا ترجمان تھا۔ جس کی اشاعت کے مقاصد میں اصلاح خیالات نسواں، مسلم مستورات کی گری ہوئی حالت کو ابھارنا، مستورات کے حقوق کا تحفظ وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں انھوں نے کم عمری کی شادی، سخت پردہ، کثیر زوجگی نظام کے خلاف مضامین لکھے اور بیوہ اور مطلقہ خواتین کی فلاح و بہبود پر زور دیا، اس رسالہ میں اڈیٹرس النساء کی تحریروں کے علاوہ سلطانہ بنت قاضی کبیر الدین، اہلیہ محمد ظہور حسن انصاری وغیرہ کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ ان ہی کی ادارت میں زیب النساء کے نام سے ایک رسالہ لاہور سے شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے عورتوں کو یہ پیغام دیا کہ 'عورتوں کو چاہیے کہ اپنی ترقی کا آپ خیال رکھیں اور یہ کوشش کریں کہ اپنی لڑکی ایسے مرد کو نہ دیں جس کے

پاس پہلی بیوی اور بچے موجود ہوں۔' اس رسالے میں زہرہ بیگم صاحبہ آروی، سعیدہ خانم، صوفیہ قیصر شگفتہ بھوپالی، جمیلہ بیگم کلکتوی، آنسہ سیدہ اشرف ناگپوری، ثریا بیگم، میر ذکیہ لکھنؤ، رفعت جمیلہ بنگلور وغیرہ کی نگارشات شائع ہوا کرتی تھیں۔

لکھنو سے 'پردۂ عصمت' کے نام سے تاریخی ناول نگار 'دل گداز' اور 'مہذب' کے مدیر مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک رسالہ نکالا جس میں انھوں نے تعلیم نسواں کی حمایت اور غیر شرعی پردے کی سخت مخالفت کی۔ پردے پر اس میں بکثرت مضامین شائع ہوئے جو بعد میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئے۔ اس رسالے کو بھی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور مولوی صاحب مطعون اور معتوب بھی ہوئے۔

'سہیلی' لاہور/امرتسر اہم نسائی رسالہ ہے جس کے سرنامہ پر یہ شعر درج ہے جو مجلّے کے مقصد و منہج کی وضاحت کرتا ہے

ہے ناصح نسواں بھی یہ رسالہ اور دل سوز سہیلی بھی
باورچن بھی مغلانی بھی استانی بھی بہیلی بھی

یہ مجلّہ افتخار النساء، خدیجہ بیگم ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل، ایم۔آر۔ایس گولڈ میڈلسٹ کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا اور اس کے عملہ ادارت میں نوشابہ خاتون قریشی امروہی بی۔اے، زہرہ بتول، رضیہ خاتون اور ام البنات، رقیہ بیگم رقی شامل رہی ہیں۔ اس رسالے کے

عنوانات بہت پرکشش اور معنی خیز ہوتے تھے۔ تذکرۂ خواتین، پردہ، کہانیاں، تربیت اولاد، متفرقات، معلومات، دستکاری، حقوق نسواں، حفظان صحت، خوان نعمت، یادداشت، گلدستہ، خطبات نسواں، آئینہ خانہ، سیر بیں، معلومات، عجائبات، عالمی نسواں، بزم خواتین، تفریح، پہیلیاں، سیر و سفر اور اس کا اداریہ 'بات چیت' کے عنوان سے لکھا جاتا تھا۔ جس میں رسالے کے مشمولات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ واقعی مکمل زنانہ رسالہ تھا جو عورتوں کو مختلف سطح پر بیدار کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ اس کے قلم کاروں میں مرد و زن سبھی شامل تھے۔ اس میں بہت سی ایسی خواتین کے نام ملتے ہیں جن کا ذکر کسی بھی تذکرے میں نہیں ملتا۔ گوہر حور میرٹھی، خدیجۃ الکبریٰ، ممتاز رفیع بیگم، رقیہ انصاری، برجیس اکرام، صفیہ بیگم قمر، عنایت احمدی بیگم، شوکت بلقیس، وحید النساء، بلقیس جمال بریلوی، طاہرہ بیگم لکھنوی وغیرہ وغیرہ۔ اس مجلّے میں جہاں بہت سے کالم بہت مفید تھے وہیں تذکرہ خواتین کے عنوان سے ایک کالم بھی ہوا کرتا تھا جس میں بائی ادے پوری، حضرت سمیہ، مہ جمال پرتھائی، مریم زمانی، گلبدن بیگم، قرۃ العین طاہرہ، حرقہ بنت نعمان، جانی بیگم، فاطمہ خانم، کرشنا کماری اور دیگر خواتین پر مضامین شائع ہوئے ہیں۔ یہ رسالہ خواتین میں بہت مقبول تھا۔ اداریے میں یہ لکھا گیا ہے کہ "اس کی روز افزوں ترقی اور بہنوں کی بیحد دلچسپی اس بات کی روشن دلیل ہے کہ حقیقی معنوں میں صنف نازک کی نہایت ہمدرد اور سچی سہیلی ہے۔" سہیلی کے خصوصی شمارے بہت مقبول ہوئے۔ اس کے سالگرہ اور عید نمبر کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ سالگرہ نمبر کی ساڑھے چار ہزار اشاعت اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اس مجلّے میں عورتوں کے مسائل پر مختلف زاویے پر گفتگو ہوتی تھی اور مختلف ممالک کی خواتین کی تعلیمی، سماجی، سیاسی حالت پر تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ پردہ اور تعلیم پر بھی خاص زور تھا۔ سہیلی کے ایک شمارے میں جہاں پردے کے تعلق سے ایک مخمس میں یہ لکھا گیا ہے کہ

ہماری صنف نازک پر تو اک احسان ہے پردہ
مسلمانوں یہ گویا رحمت رحمٰن ہے پردہ
نسائیت کے پیکر میں مثال جان ہے پردہ
حفظ دولت عفت کا اک سامان ہے پردہ

تو وہیں ایڈیٹر نے رواجی پردے کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'اس کی بدولت ہزاروں مائیں بہنیں ایسی ہوں گی جو علم جیسے قیمتی خزانے سے محروم ہوں اور سیکڑوں جانیں ایسی ہوں گی جو طرح طرح کے متعدد امراض کا شکار ہو کر موت کے گھاٹ اتر چکی ہوں۔ دق اور سل

جیسے متعدد امراض نے آج جس سرعت سے بڑھنا شروع کیا ہے وہ اسی مقید زندگی کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔ انھوں یہ بھی لکھا کہ 'میرا مدعا ہرگز نہیں کہ جسمانی صحت اور تعلیم کے لیے عصمت جیسی نایاب دولت کو قربان کر دیا جائے بلکہ پردے کے ناجائز استعمال سے عورتوں کے ان حقوق کی پامالی نہ کی جائے جو فطرت نے اس کو بخشی ہے۔' (سہیلی، امرتسر، اپریل 1928)

بھوپال سے ماہنامہ الحجاب کا اجرا سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال کی سرپرستی اور محمد یوسف قیصر بھوپالی کی ادارت میں ہوا۔ اس رسالے کے موضوعات میں تعلیم، لباس، پردہ اور دیگر نسائی متعلقات شامل تھے۔ 1909 میں یہ رسالہ جاری ہوا اور ڈاکٹر محمد نعمان خان کے مطابق 'قارئین کی سرد مہری اور عدم توجہی کے باعث حالات کے نامساعدت کا شکار ہو کر ستمبر 1911 میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔'

بھوپال ہی سے ایک اور رسالہ ماہنامہ ظل السلطان سلطان جہاں بیگم کی سرپرستی اور محمد امین زبیری کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے سرورق پر 'ہندوستانی خواتین کی علمی دلچسپیوں کا ایک ماہوار رسالہ' درج تھا۔ رسالے کے مقاصد و قواعد وضوابط کے تحت یہ لکھا گیا تھا کہ 'اس رسالہ کا مقصد خواتین ہند میں اشاعت و ترویج و تعلیم اور ان کے لیے مفید کارآمد کا معلومات کا فراہم کرنا ہے۔' ریختہ پر دستیاب ظل السلطان کے شماروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ واقعی اس رسالے میں مستورات اور مخدرات کے لیے مفید معلوماتی مضامین شائع ہوتے تھے۔ فاطمہ صغریٰ بنت احمد حسن، زہرہ سلطان، م ب صاحبہ لکھنوی، مسز اسلم، عالیہ خاتون، اختر دلہن، ب بیگم صاحبہ کی تحریریں اس مجلّے میں شائع ہوتی تھیں اور فہرست مضامین سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجلّہ خواتین کی تعلیم اور سماجی ترقی کے لیے شائع ہوتا تھا۔ اس میں خواتین اسلام کی اصلاح و ترقی، یورپ میں لڑکیوں کی تعلیم، زنانہ تعلیم کی اہمیت، انگریزی تعلیم نسواں، خواتین اسلام کے جذبات، خواتین سلطان محمد از بکستان، عورت ابن رشد کی نظر میں اور اس طرح کے دیگر اہم موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ عالم نسواں کے عنوان سے بھی ایک کالم تھا۔

بھوپال ہی سے قمر النساء کی ادارت میں 'امہات' کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوتا تھا اس کے مالک محمود الحسن صدیقی تھے۔ ڈاکٹر نعمان خان نے اس کا سنہ اشاعت 1933 درج کیا ہے۔ اور اس رسالے کے درج ذیل اغراض و مقاصد تحریر کیے ہیں۔

(1) تعلیم نسواں کی ترویج و ترقی (2) خواتین میں علمی ادبی ذوق پیدا کرنا (3) مضر رسوم انسداد (4) خواتین کے معاشرتی شہری اور ملکی حقوق کا تحفظ (5) اصول سیاست عامہ سے خواتین کو روشناس کرانا (6) نظام معیشت اور طریق خانہ داری میں مناسب اصلاح (7) ماؤں اور بچوں کی صحت و زندگی کا تحفظ (8) قومی مجالس کی تنظیم کی ضرورت کا احساس پیدا کرنا (9) مفید گھریلو صنعتوں کی ترویج و ترقی (10) اصول کفایت شعاری اور امداد باہمی کی ترویج (11) مفید نسوانی تحریکات کی حمایت۔

اس رسالے نے بھی عورتوں کو بیدار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سارے نسائی رسائل ہیں جو مختلف علاقوں سے شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں 'ماہنامہ رضوان' لکھنؤ، ماہنامہ افشاں بھوپال، رہبر ممبئی، مالیگاؤں سے نکلنے والے 'ماہنامہ خوشبو'، 'گلشن خواتین'، الطاہرات'، صدائے نساء' وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مگر بیشتر رسائل کی مدت حیات بہت مختصر رہی۔ اب خواتین ڈائجسٹ بھی شائع ہو رہے ہیں جو اشرافیہ طبقے میں بہت مقبول ہیں۔ مگر زیادہ تر ڈائجسٹ خواتین کی تعلیم و تربیت اور حقوق نسواں سے آگہی کے بجائے ذہنی تفریح کے لیے شائع کیے جاتے ہیں۔ ان میں پاکیزہ آنچل، ہما، مشرقی آنچل اور پاکستان سے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

خواتین سے مختص جتنے قدیم رسائل ہیں ان میں بہت اہم نسائی موضوعات اور متعلقات پر مضامین ہیں ضرورت ہے کہ ان قدیم نسائی رسائل کے انتخابات شائع کیے جائیں تا کہ اس عہد کی خواتین کے انداز نظر کا نہ صرف پتہ لگ سکے بلکہ قلمکار خواتین سے بھی ہم واقف ہوسکیں۔ ہندی میں 'کلام نسواں' کے عنوان سے شاید اس طرح کی کوشش ہو چکی ہے۔ اردو میں بھی اس طرح کی کوشش کی جانی چاہیے تا کہ ماضی کی نسائی صحافت اور نسوانی سوچ کے منظر نامہ سے آگہی ہو سکے۔

موجودہ دور میں خواتین سے مختص بہت کم رسالے شائع ہوتے ہیں مگر کچھ خواتین ایسی رہی ہیں جو خواتین کے مسائل و موضوعات پر لکھتی رہتی ہیں۔ اور بہت سی خواتین پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے بھی جڑی رہی ہیں۔ ایسی خاتون صحافیوں میں جیلانی بانو، اختر جہاں، ثریا ہاشمی، سلطانہ حجاب، خالدہ بلگرامی، سعدیہ دہلوی، نور جہاں ثروت، فرحت رضوی، شیریں دلوی، عالیہ ناز، آمنہ تحسین، وسیم راشد، تسنیم کوثر، شہلا نواب، غزالہ صدیقی، رضیہ حامد، رئیسہ منور، زیب النسا، نرگس سلطانہ، جہاں آرا، راسیہ نعیم ہاشمی، سفینہ عرفات، رفیعہ نوشین، نسیم سلطانہ وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

عورتوں کو بیدار کرنے میں نسائی صحافت کا بہت اہم کردار یوں بھی رہا ہے کہ کمزور سمجھے جانے والی صنف اپنے قلم کی طاقت سے اپنے نسائی وجود اور قوت کا احساس کرانے میں یقینی طور پر کامیاب ہے۔ اگر یہ رسائل نہ ہوتے تو خموشی کی زبان آوازوں میں تبدیل نہ ہوتی اور نہ ہی یہ اپنے زخموں کو زباں کر پاتی۔ ان رسائل کی وجہ سے خواتین کو ایک مضبوط پلیٹ فارم مل گیا۔ مگر یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ خواتین یا زنانہ رسائل کی اشاعت کا سہرا بھی مردوں کے سر ہے اور نسائی صحافت کے بنیاد گزار بھی مرد حضرات ہی ہیں۔ ہندوستان کی سطح پر تانیثیت کا منشور یا ایجنڈا بھی مردوں ہی کا تیار کردہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد نے سب سے پہلے تانیثیت کا ایجنڈا تیار کیا تھا۔ تعلیم اور ترقیِ نسواں کے ذیل میں جسٹس امیر علی، سید محمود، کرامت حسین اور مجالس النسا والے حالی کو بھی فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ سب سے پہلے فیمنزم کی اصطلاح کو ایک فرانسیسی فلسفی نے ہی وضع کیا تھا جس کا نام تھا چارلس فوریر Charls Fourier۔ اس کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا مگر بعد میں فیمنزم بے راہ روی پر اتر آئی اور اس نے مرد کردار کو مشکوک اور مشتبہ قرار دینے کے لیے بہت سے مفروضے گڑھ لیے اور یہ کہا جانے لگا کہ مردوں نے ہی عورتوں کو حاشیے پر ڈال رکھا ہے اور ان سے جنت چھین لی ہے۔ یہاں میں نسائی معاشرے سے یہ سوال پوچھنے میں حق بہ جانب ہوں کہ عورتوں کا تذکرہ 'بہارستان ناز' کس نے لکھا تھا۔ 'تذکرہ شاعرات اردو' کس نے مرتب کیا تھا۔ 'شمیم سخن' کس نے لکھا تھا۔ جواب یہی آئے گا کہ بالترتیب حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی، جمیل احمد، عبدالحی صفا بدایونی مرد طبقے سے تعلق رکھنے والے ہی ان تذکرہ و تذکار خواتین کے مصنف ہیں۔ اس لیے بلا خوف لومۃ لائم مجھے یہ کہنے دیجیے کہ مردوں نے ہی عورتوں کے خیالوں کو زمین اور خوابوں کو آسمان عطا کیا ہے اور ان کے حوصلوں کو نئی اڑان دی ہے۔

استفادی کتابیات

(الف) کتب

انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ

ارتضٰی کریم، اردو صحافت کے دو سو سال۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ 2017

جمیل اختر، اردو میں جرائد نسواں۔

محمد نعمان خان، بھوپال میں اردو انضمام کے بعد، ایجوکیشنل پبلشنگ دہلی، 2006

آمنہ تحسین، حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب، ایجوکیشنل پبلشنگ دہلی، 2017

نعیم طاہر، سیدہ محمدی بیگم۔

(ب) مقالات

Gail Minault, Women's Magazines in Urdu as source of Muslim Social History (Indian Journal of Gender Studies 5:2, 1998)

Gail Minault, "Sayyid Mumtaz Ali and Huquq-un-niswan An Advocate of Women's Rights in Islam in the Late Nineteenth Century", Modern Asian Studies 24(1) 147-72

نور جہاں ثروت، اردو صحافت میں خواتین کا حصہ، مشمولہ، اردو صحافت ماضی اور حال، مرتبین: خالد محمود، سرور الہدیٰ۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

مرضیہ عارف، ہندوستان میں خواتین کی اردو صحافت، مشمولہ اردو صحافت دوسو سالہ یادگاری مجلّہ، مرتبین سہیل انجم، معصوم مرادآبادی۔

داؤد عثمانی، ماہنامہ عصمت کے سو برس ایک مختصر جائزہ

OOO

haqqanialqasmi@gmail.com

Cell : 9891726444

ڈاکٹر نعیمہ جعفری کی 'یادیں اور باتیں'

ڈاکٹر عبیداللہ چودھری

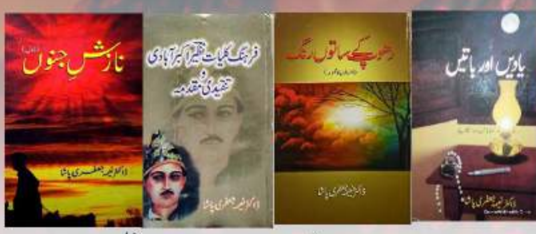

آج کے عہد کے ہندوستان میں آسمان اردو ادب میں ڈاکٹر نعیمہ جعفری کا نام خواتین افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے ان کی تصانیف کو ادب العالیہ (Classic) کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو زبان و ادب میں ایم۔ اے کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا موضوع (1) 'فرہنگ کلیات نظیر اکبر آبادی' دیگر تصانیف میں (2) ٹوٹا ہوا آدمی۔ (افسانوی مجموعہ) (3) ''یادِ رفتگاں''، (4) مانو یا نہ مانو (فکشن)، (5) محفل میلاد النبی، (6) آٹھ راتیں سات کہانیاں (ادب اطفال)، (7) شجر سایہ دار (خاکے)، (8) دھوپ کے ساتوں رنگ (افسانوی مجموعہ)، (9) نازشِ جنوں (ناول) اور دسویں تصنیف راقم کے روبرو ہے جس کا نام ہے ''یادیں اور باتیں'' جو مضامین اور انشائیے کا مجموعہ ہے۔ جس میں 29 مضامین ہیں اور سبھی لائق مطالعہ ہیں ترتیب اس طرح ہے 1۔ حضرت قبلہ نیاز احمد صاحب بریلوی کی شاعری میں اسرار تصوف 2۔ لغات نظیر کا محرم حضرت محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی 3۔ راجستھان کا ایک نامور شاعر حضرت احمد علی شاہ قمر جعفری 4۔ برج دیش کا سچا عاشق نظیر اکبر آبادی، 5۔ نظیر اکبر آبادی کے فارسی خماجات اور ترجمہ، 4۔ امریتا پریتم۔ اپنے دو ناولوں کے آئینے میں۔ 7۔ مزاح نگاری اور مجتبیٰ حسین، 8۔ اردو تذکرہ نگاری کا آغاز و ارتقا، 9۔ عبدل بسم اللہ کا ناول ''جھینی جھینی بینی چدریا'' ایک تجزیاتی مطالعہ، 10۔ شوکت پردیسی ایک بھولا بسرا شاعر، 11 ایک یادگار تاریخی مشاعرہ، 12۔ کہانی کی کہانی رتن سنگھ، 13۔ مسرور جہاں اور نسائی ادب، 14۔ راشدہ خلیل ایک خراج عقیدت، 15۔ داستان گوئی کا پنر جنم اور محمود فاروقی، 16۔ دہلی کی چند منفرد خواتین افسانہ نگار، 17۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں، 18۔ تخلیق و تنقید، 19۔ مواد اور ہیئت، 20۔ افلاطون، 21۔ ڈرائیڈن، 22۔ کولرج کا نظریہ تخیل، 23۔ نوکلاسیکی اقدار کے خلاف ردعمل اور رومانیت کی ابتدا، 24۔ جمعہ کی فضیلت، 25۔ نوادرات، 26، علی گڑھ سے واپسی، 27۔ افواہیں، 28۔ سو ہے وہ بھی آدمی 29۔ ہماری غائب دماغیاں۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری کا تعلق آگرے کے عالم، ادبی، صوفی سید خاندان سے ہے ان کے تایا میکش اکبر آبادی کا نام اردو داں طبقے کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے والد سید احمد علی شاہ جعفری راجستھان کیڈر کے I.A.S آفیسر ہونے کے ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر اور نثر نگار تھے ان کی والدہ کا تعلق جے پور کے ایک مشہور صوفی سید جاگیردار خاندان سے تھا۔ نعیمہ کے نانا مولانا انوار الرحمٰن بسمل جے پوری کثیر التصانیف ادیب اور شاعر تھے والدہ نجمہ جعفری خود بھی صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں شاعری ہواؤں اور فضاؤں میں بستی تھی۔ ہوش سنبھالا تو قلم بھی سنبھال لیا کم عمری میں ان کی کہانیاں ملک کے کثیر الاشاعت رسائل میں شائع ہونے لگی تھیں اکیس سال کی عمر میں انھوں نے مضمون نگاری کے ایک قومی مقابلے میں شرکت کی اور اردو کے لیے پہلا انعام حاصل کیا۔ 2008 میں ان کی کتاب 'یادِ رفتگاں' کو اردو اکادمی دہلی نے انعام سے نوازا۔ 2012 میں دوسرا

انعام 'آٹھ راتیں سات کہانیاں' کو ملا۔ افسانوی مجموعہ 'حقیقت سے افسانہ تک' کو دہلی اردو اکادمی نے 2019 میں انعام سے نوازا۔ علاوہ ازیں بہار اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی نے بھی کئی کتابوں پر انعام دیے بزم میکش ہریانہ نے ساہتیہ شبلی ایوارڈ سے نوازا۔ دہلی کے اوکھلا علاقے میں نعیمہ جعفری ایک کوچنگ سینٹر چلا رہی ہیں۔ جہاں وہ بی۔اے اور ایم۔اے کی ان طالبات کو کوچنگ کراتی ہیں جو یونیورسٹی میں ریگولر داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے پرائیویٹ امتحانات پاس کر کے اپنی قابلیت بڑھاتی ہیں اور روزگار حاصل کرتی ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے موصوفہ نے پرواز نامی ایک لٹریری کلب قائم کیا ہے۔ جہاں طالبات اور خواتین کی اردو پڑھنے اور اردو میں کہانیاں نظمیں اور مضامین لکھنے کے لیے ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ اس کلب کی میٹنگ سہ ماہی ہوتی ہے۔ جس کی رپوٹ 'پرواز' نامی کتابچے کی شکل میں شائع ہوتی ہے۔ کسی بھی قسم کی مالی امداد نہ ہونے کی صورت میں یہ جوکھم بھرا کام ہے جو گذشتہ کئی برسوں سے نعیمہ جعفری بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ کرتی آ رہی ہیں۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری کی یہ گراں قدر تصنیف ان کی یادوں کا وہ خزانہ ہے جسے انھوں نے بڑے ہی جتن سے سنبھال کر رکھا ہے۔ جیسے یہ کوئی انمول چیز ہو جس کے کھو جانے کا ڈر ہمیشہ پریشان کرتا رہا ہو۔

اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں:

> ''زیر نظر کتاب 'یادیں اور باتیں' میں میرے وہ مضامین شامل ہیں جو میں نے کسی خاص تحریک (سیمینار۔ ورکشاپ یا فرمائش) پر نہیں لکھے بلکہ ذہن میں کسی خاص شخصیت یا موضوع پر خیالات کی یلغار ہوئی تو نوک قلم پر آ گئے ان میں چند مضامین رسالوں میں شائع ہوئے باقی صرف میری ڈائریوں تک محدود تھے کچھ انشائیہ یا مزاحیہ مضامین بھی ہیں جو بقول وزیر آغا میرے ذہن کی ڈھیلی ڈھالی اڑان ہیں ان تحریوں کو میں نے یادوں اور باتوں کا نام دیا ہے۔ ان کے علاوہ میرے شفیق استاد محترم خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کے کچھ لکچر بھی شامل ہیں جو انھوں نے ایم۔اے میں دوران تدریس دیے تھے اور جن کی میں نے پینتالیس سال حفاظت کی۔ میرے لیے یہ ادبی تبرک کا درجہ رکھتے ہیں اور اب میں اس مجموعے میں شامل کر کے اردو والوں کو اور خصوصاً طلبا و طالبات کو بطور سوغات پیش کر رہی ہوں۔''

سرزمین ہندوستان میں معروف و ممتاز شاعروں کی فہرست میں ایک نام نظیر اکبرآبادی کا بھی آتا ہے۔ تحقیقی مقالہ کا موضوع بھی اچھوتا رہا ہے ان کے مقالہ کا عنوان ہے 'فرہنگ کلیات نظیر اکبرآبادی' نعیمہ جعفری نے نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا بخوبی مطالعہ کیا ہوگا۔

ہندوستان میں جتنے بھی شاعر اعظم پیدا ہوئے سب کی اپنی اپنی انفرادیت رہی ہے اور یہی انفرادیت ان کی اپنی پہچان بن گئی کوئی شاعر انقلاب ہوا اور کوئی محبّ وطن، جگر مرادآبادی کو عشق و محبت کے نازک خیالات کے ذریعہ فلسفۂ حیات کا شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں نظیر اکبرآبادی کا بھی نام آتا ہے۔ نظیر کو ہم شاعر انسانیت کے لقب سے یاد کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے نظیر اکبرآبادی کے مضمون میں انھیں برج دیش کا سچا عاشق لکھا ہے۔ انھوں نے ابوالکلام عارف کی تحریر رقم کی ہے۔ نظیر اکبرآبادی ہندوستان میں بسنے والے ہر فرد سے محبت کرتے تھے اور انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب و ملت اور طبقے سے کیوں نہ ہو۔ نظیر کی نظر میں سب برابر ہیں انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ محبت، اخوت، یکجہتی، رواداری اور بھائی چارگی کا درس دیا ہے۔ اردو کی کلاسیکی شاعری کا جو قابل لحاظ سرمایہ ہے وہ عموماً غیر ملکی امثال سے بھرا ہوا ہے۔ ہر صفحے پر دجلہ و فرات، نیل لہریں مارتا نظر آتا ہے۔ ہر باغ میں سرو و صنوبر کے سائے ملیں گے اور ان پر بلبلیں اور قمریاں نغمہ خواں سنائی دیں گی۔ قیس و لیلیٰ اور شیریں و فرہاد کی داستان عشق کا بیان اور حوالے ملیں گے سمرقند و بخارا کے تذکرے ملیں گے لیکن نظیر اس ساری بھیڑ سے بالکل الگ اور منفرد نظر آتے ہیں ان کا ذہن سمرقند بخارا کے بجائے متھرا برج اور بنارس کی سیر کرتا ہے۔ ان کی آنکھیں دجلہ و فرات کی جگہ گنگا اور جمنا کے نرمل جل سے سیراب ہوتی ہیں۔ نظیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ خواص نے انھیں صف اول کے شاعروں میں جگہ دینے میں تاخیر کی ہے تاہم انھیں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا وہ اپنے عہد کے ہر دلعزیز شاعر تھے۔ آج کے دور میں بھی جبکہ مذہبی رواداری اور سیکولرزم کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کا فقدان ہے۔ نظیر کی شاعری کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے چاہے عید ہو شب برات ہو، ہولی، دیوالی، جنم اشٹمی، راکھی ہو یا میلے ٹھیلے ہوں۔ نظیر کی نظمیں ہمیں پیار و محبت، مذہبی رواداری کا احساس شدت سے دلاتی ہیں۔ نظیر کے دل میں اپنے ملک کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

ہندوستان میں خواتین افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ تاہم شہرت اور مقبولیت کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ پنجاب کی سرزمین سے ایک اہم نام امریتا پریتم کا آتا ہے۔ امریتا پریتم کے بارے میں ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے لکھا ہے۔ ''13 اگست 1919 کے دن

متحدہ ہندوستان کی پنجاب ریاست کے شہر گوجرانوالہ میں ایک اسکول ماسٹر کرتار سنگھ ہتکاری اور راج بی بی کے یہاں ایک خوبصورت سی بچی نے جنم لیا۔ جس کا نام امرت کور رکھا گیا جو بعد میں امریتا پریتم کے نام سے جہان ادب میں مشہور ہوئیں۔ کرتار سنگھ شاعر بھی تھے اور صحافی بھی۔ امریتا کو تخلیقی صلاحیت ورثے میں ملی تھی۔ والد کی شعری تخلیقات پڑھ کر امریتا کے اندر بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے چھوٹی نظمیں کہنی شروع کر دیں۔1936 میں صرف سترہ سال کی عمر میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''امرت لہراں'' کے نام سے شائع ہوا اسی سال ان کی شادی پریتم سنگھ نامی لاہور کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ سے کر دی گئی جس کے ساتھ امریتا کو کبھی ذہنی ہم آہنگی کا احساس نہیں ہوا گو کہ پریتم سنگھ کے رشتے کے حوالے سے ہی ان کے نام میں پریتم کا اضافہ ہوا۔ جسے انھوں نے مرتے دم تک شامل رکھا۔ پریتم سنگھ کسی بھی طرح امریتا کے قابل نہ تھے اسی لیے ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ ہو سکی اور آخر امریتا نے پریتم کے ساتھ اس مصنوعی رشتے کے بندھن کو ختم کر دیا۔ امریتا کی زندگی میں دو مرد آئے ایک ساحر لدھیانوی جنھیں وہ میرا محبوب، میرا شاعر، میرا خدا، میرا دیوتا مانتی تھیں۔ ساحر کو انھوں نے ٹوٹ کر چاہا لیکن ساحر سے ان کی شادی نہ ہو سکی۔ دوسرے امروز جن کے ساتھ انھوں نے اپنی زندگی کا باقی سفر بغیر کسی قانونی یا سماجی ضابطے یا سند کے طے کیا۔ اپنی خودنوشت رسیدی ٹکٹ میں امریتا نے بڑی بہادری کے ساتھ بے خوف ہو کر ساحر سے اپنا عشق اور امروز سے اپنے تعلق کا ذکر کیا ہے۔ جو ان کے حوصلے بلند ہمتی اور سچائی کی دلیل ہے۔ امریتا پریتم بحیثیت عورت انسانیت کے درد کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تحریر کو صفحۂ قرطاس پر رقم کرتی ہیں۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے اپنی کتاب میں شوکت پردیسی کو ایک بھولا بسرا شاعر رقم کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ شوکت پردیسی کا اصل میدان ادب اطفال ہی تھا لیکن ان کے مجموعہ کلام ''ساز نغمہ بار'' اور ''مضراب سخن'' کی ورق گردانی کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شوکت پردیسی غزل اور نظم دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق اور منجھے ہوئے شاعر تھے۔ وقت اور حالات نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی۔ زندگی ان کے لیے مسلسل امتحان کا باعث بنتی رہی۔ تاہم نا مساعد حالات میں بھی انھوں نے شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شوکت پردیسی کی شاعری ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔''

''کہانی کی کہانی''، رتن سنگھ مضمون میں ڈاکٹر نعیمہ جعفری کا لکھتی ہیں:

''رتن سنگھ کی پیدائش 15 نومبر 1927 میں ضلع سیالکوٹ کے قصبے داؤد میں ہوئی۔ قصبے میں صرف ایک ہی اسکول تھا جو چھٹے درجے تک تھا۔ ابتدائی تعلیم رتن سنگھ نے اسی اسکول میں حاصل کیا۔ پرائمری پاس کر کے ڈیرہ بابا نانک کے گورنمنٹ خالصہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔1945 میں میٹرک کا امتحان پاس کر لینے کے بعد انھوں نے ریلوے میں کلرک کی نوکری کر لی۔13 اگست 1946 کو ان کی ملازمت کی ابتدا ہوئی اگلے ہی سال تقسیم کا سانحہ گزر را۔ رتن سنگھ مع خاندان ہجرت کر کے لکھنؤ آ گئے۔ رتن سنگھ نے اپنی زندگی کا آغاز پنجابی زبان سے کیا۔1950 سے ہی ان کی کہانیاں اور نظمیں پنجابی ادب میں مقبول ہونے لگی تھیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر اس سے جڑ گئے۔ وہ پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور سے خصوصی طور سے متاثر تھے ان کی کہانیوں میں بہتر مستقبل کا خواب تھا۔ ان کا فلسفہ ہے کہ ''زندگی بہتری مانگتی ہے'' اس لیے زندگی کو اور زندگی کے حوالے سے قلم کو فعال رہنا چاہیے کہانی لکھنے کا مقصد زندگی کو خوبصورت بنانا ہے اس لیے ہر کہانی کی ایک کہانی ہوتی ہے۔

معروف خاتون افسانہ و ناول نگار مسرور جہاں کے بارے میں ڈاکٹر نعیمہ جعفری رقم طراز ہیں:

> ''ابتدائی دور میں دوسرے بہت سے فکشن نگاروں کی طرح مسرور جہاں نے بھی رومانی ناول اور کہانیاں لکھیں لیکن ان میں بھی سماجی سروکار تہذیبی اور ثقافتی عکس اور نسائی مسائل کا پہلو رومان پر حاوی رہتا ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں کا پس منظر زوال پذیر جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کے تناظر میں سسکتا ہوا معاشرہ ہے۔ ان میں تقسیم کا درد بھی ہے اور عورت کے استحصال کی کہانی بھی ہے۔ مسرور جہاں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ ہماری روز مرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسرور جہاں کا ماننا تھا کہ ''میں جو کچھ لکھتی ہوں وہ اپنے قارئین کے لیے لکھتی ہوں نہ کہ ناقدین کی کسوٹی پر رکھے جانے کے لیے'' یہی وجہ ہے کہ قاری جب ان کی کہانیوں اور ناولوں کو پڑھتا ہے تو اس کے دل کو چھو جاتے ہیں۔ ملک کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی منظر نامے سے متعلق حالات واقعات جذبات واحساسات

جب ان کے نوک قلم سے صفحہ قرطاس پر بکھرتے ہیں تو پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔"

ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے ایک مضمون میں دہلی کی چند اہم خواتین افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جو خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ان کا مختصراً ذکر کیا جانا ناگزیر ہے۔صالحہ عابد حسین کا شمار اردو کی چوٹی کی خواتین قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق ایک مشہور علمی اور ادبی خانوادے سے ہے مولانا الطاف حسین حالی کی بیٹی کی اولاد میں تھیں۔وہ خواجہ غلام الثقلین کی بیٹی خواجہ غلام السیدین کی بہن اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی شریک حیات تھیں۔کثیر التصانیف ادیبہ تھیں جن میں پانچ افسانوی مجموعے اور نو ناول شامل ہیں۔ان کے افسانوں میں ہندوستان کی آزادی کے ضمن میں فسادات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔انھوں نے صرف فسادات کی تباہ کاری کو ہی محسوس نہیں کیا بلکہ اس دوران اتحاد اور یکجہتی کے جو واقعات سامنے آئے انھیں بھی پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کا موضوع عورت ہے۔وہ عورت کے درد کو اچھی طرح محسوس کرتی ہیں وہ سماج میں عورت کے ایثار و قربانی کے جذبے کو بھی اپنے متعدد افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔

حمیدہ سلطان کی پیدائش 1914 میں پرانی دہلی کے کوچہ پنڈت میں ہوئی انھوں نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ان کی زندگی کا کچھ حصہ آسام اور حیدرآباد میں بھی گزرا تھا اسی لیے ان کی بعض کہانیوں میں ان شہروں کی تہذیب اور رسم ورواج کا بھی بیان ملتا ہے۔خاص طور سے آسام کی قبائلی زندگی سے بہت متاثر تھیں۔ان کی کہانی ''نیلمبر'' ناگا پہاڑیوں میں آباد ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی کی داستان عشق ہے اس میں قبائلی زندگی کے رسم ورواج اور معاشرت کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ایک اور کہانی ''ناگ دیوتا'' میں آسام اور اس کے قرب وجوار میں پروان چڑھتی ہے۔اس کے علاوہ حمیدہ سلطان نے اپنے کئی افسانوں میں امیر گھرانوں کی شان وشکوت اور فرسودہ رسم ورواج پر گہرا طنز کیا ہے۔زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے اور انداز بیان خوبصورت اور دلچسپ ہے۔منظر نگاری اور جذبات نگاری میں بھی ان کا قلم خوبصورت مثالیں قائم کرتا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر مشہور ادیب ترقی پسند تحریک کے علمبردار سجاد ظہیر کی شریک حیات کا نام ہے۔ان کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں اشتراکی سوچ کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔انھوں نے عام آدمی کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کے درد کو گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ان کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔رضیہ کے افسانوں میں منظر نگاری اور کرداری نگاری بے حد خوبصورت انداز میں پیش کی گئی ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں پہلا 'زرد گلاب' اور دوسرا 'اللہ دے بندہ لے'۔

آمنہ ابوالحسن کا تعلق حیدرآباد سے تھا لیکن لمبے عرصے تک دہلی میں مقیم رہیں۔دہلی کے دوران قیام ہی ان کے دو افسانوی مجموعے 'کہانی' اور 'بائی فوکل' شائع ہوئے۔ان کے بیشتر افسانوں کا موضوع عورت کی نفسیات سے ہیں۔انھوں نے عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے ان کی کہانیاں انسانی جذبات کی عکاسی ہیں۔

خواتین ممتاز افسانہ نگاروں میں صغریٰ مہدی کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔مصنفہ ایک لائق استاد ایک سماجی کارکن، قابل افسانہ نگار، ناول نگار، طنز ومزاح نگار اور مضمون نگار تھیں۔صغریٰ مہدی کثیر التصانیف ادیبہ تھیں ان کے چار افسانوی مجموعے 'پتھر کا شہزادہ' جو میرے ہیں وہ راجہ کے نہیں'، 'پہچان' اور 'پیشین گوئی' علاوہ ازیں پانچ ناول 'پروائی'، 'جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو'، 'پا بہ جولاں'، 'دھندھ' اور 'کوئی در آشنا' شائع ہو چکے ہیں۔صغریٰ مہدی کے بیشتر افسانے سماجی اور اصلاحی ہیں ان کی کہانیوں میں گنگا جمنی تہذیب سانس لیتی نظر آتی ہے۔ان کے افسانے افسانوی ادب کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

شمیم نکہت کا شمار دہلی کی معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔تاہم ان کا وطن لکھنؤ ہے لیکن انھوں نے اپنی ملازمت کی ابتدا دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے کی۔ جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے 38 سال گزارے۔شمیم نکہت کے افسانوں کا مجموعہ 'دو آدھے' 1989 میں شائع ہوا۔ان کے افسانوں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے مسائل کو نہیں بلکہ اپنے ملک اور اپنے سماج کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں۔انھوں نے عورت کے ہر روپ کو دیکھا ہے اور اس کے درد کو محسوس کیا ہے اور یہیں سے اپنے کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔شمیم نکہت اپنے بارے میں لکھتی ہیں۔''میں شدت پسند کبھی نہیں رہی ہوں لیکن صدیوں سے عورتوں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف میرا قلم اٹھ جاتا ہے۔میری کہانیوں کا عام موضوع عورت ہے۔''

شمیم نکہت نے اپنے افسانوں کے لیے بیانیہ تکنیک کو اپنایا ہے۔ان کا انداز بیان نہایت دلکش اور پر اثر ہوتا ہے۔مجموعی اعتبار سے شمیم نکہت کے افسانے اردو فکشن نگاری میں گرانقدر اضافہ ہیں۔

ترنم ریاض کی پیدائش اور تعلیم وتربیت کشمیر میں ہوئی۔ان کے والد ایئر فورس میں پائلٹ تھے لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے۔ترنم ریاض

نے کشمیر یونیورسٹی سے ایجوکیشن اور اردو میں ایم۔اے کیا اور ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔1980 کے بعد جن خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے ان میں ترنم ریاض کا نام سرفہرست ہے یوں تو ان کا بنیادی میدان افسانہ نگاری ہے تاہم انھوں نے بحیثیت ناول نگار، مضمون نگار اور تنقید نگاری میں بھی اپنی اہمیت تسلیم کرائی ہے۔ ترنم ریاض کا قلم زرخیز ہے وہ ایک ہمہ جہت قلمکار ہیں انھیں بہت سے ایوارڈ اور اعزازات مل چکے ہیں جن میں سب سے اہم 'سارک لٹریری ایوارڈ' ہے۔

ناصرہ شرما کی پیدائش اتر پردیش کے شہر الہ آباد میں 1948 میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم الہ آباد سے حاصل کی وہیں سے بی۔اے کرنے کے بعد وہ دہلی آ گئیں جواہر لعل یونیورسٹی سے فارسی زبان و ادب میں ایم۔اے کیا۔ ہندی اردو، فارسی، انگریزی اور پشتو زبانوں پر انھیں عبور حاصل ہے۔ناصرہ شرما کے دس ناول اور نو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تخلیقی کاوشوں کے اعتراف میں مختلف اداروں اور تنظیموں سے تقریباً 15 انعامات مل چکے ہیں۔

دہلی میں اردو کی خواتین قلمکاروں میں بلقیس ظفیر الحسن کا نام بہت معتبر سمجھا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے وہ بلقیس رحمانی بانو کے نام سے کہانیاں لکھتی تھیں۔ بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ویرانے آباد گھروں کے' کافی مقبول ہوا تھا۔ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی ادیبہ ہیں جن کا قلم بیک وقت افسانہ، ڈرامہ، مضمون نگاری اور شاعری کے میدان میں اپنے جوہر دکھاتا ہے یہ اپنے آپ میں خود ایک انجمن ہیں۔

انور نزہت کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں متوسط طبقے کی خواتین کے گھریلو مسائل کو بڑے سیدھے سادے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہانی لکھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ زبان و بیان اور پلاٹ پر ان کی گرفت مضبوط رہتی ہے۔ان کے افسانے دلچسپ اور حقائق سے بھرپور ہوتے ہیں۔ان کا قلم قنوطیت کی سیاہی میں ڈوب کر چلتا ہے اور زندگی کے مثبت پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ انور نزہت خود اپنے بارے میں لکھتی ہیں۔ "میرے افسانوں کا بنیادی کردار متوسط طبقے کی عورت کے مختلف روپ ہیں۔"

دہلی کی خواتین افسانہ نگاروں میں نگار عظیم کا نام حقیقت میں عظیم ہے۔ تقریباً نصف صدی سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور دہلی کی ممتاز قلمکاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ نگار عظیم کا اصل نام مہر نگار ہے۔ وہ میرٹھ میں پیدا ہوئیں اور مراد آباد میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم۔اے۔اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ان کا تحقیقی مقالہ 'منٹو کا سرمایہ فکر و فن' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نگار عظیم کے افسانے انسانی اور جذباتی رشتوں کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کی نگارشات کی خصوصیت ان کا اختصار ہے۔یعنی وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ان کا قلم کہیں کہیں بے باب بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سماج کے ناسور کو برہنہ کر کے قاری کے سامنے لانا چاہتی ہیں۔ وہ منٹو سے متاثر ہیں ان کا قلم آج بھی سرعت کے ساتھ متحرک ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے اپنی تصنیف میں نگار عظیم کے ساتھ ساتھ چند اور خواتین معروف افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں شمع افروز زیدی، رخشندہ روحی، شاہدہ منیر، نفیس بانو شمع، غزالہ قمر اعجاز، نشاط اسلم اور خود نعیمہ جعفری ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی نعیمہ جعفری کے استاد تھے۔ وہ نہ صرف قابل و فاضل استاد بلند پایہ شاعر و نقاد تھے بلکہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ایک مخلص اور ایماندار استاد جو اپنے پیشے کے تئیں بے حد Dedicated تھے۔ جن کے علم کا بحر ذخار ہر اس طلب علم کے لیے موجزن رہتا تھا جو طالب علم کی سچی لگن رکھتا تھا۔ خلیل صاحب نے ہمیں غالب کا خصوصی مطالعہ اور اردو تنقید کے مضامین پڑھائے کہ از بر یاد ہو گئے۔ نعیمہ جعفری کہتی ہیں کہ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے لکھائے نوٹس آج بھی ان کے پاس محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے اپنی اس تصنیف میں چند انشائیے بھی رقم کیے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ انشائیہ 'جمعہ کی فضیلت' میں ان کا قلم لکھتا ہے۔ 'ہم مسلمانوں کے یہاں جمعہ کے دن کو بہت افضل سمجھا جاتا ہے آج کل سوشل میڈیا کے دور میں صبح سے ہی فیس بک اور واٹس ایپ پر 'جمعہ مبارک' کے پیغامات کی بھرمار ہوتی ہے جتنے بھی مبارک کام ہیں اسی دن انجام پاتے ہیں کسی بھی شخص سے جمعہ کے دن کوئی کام کے لیے کہیے تو وہ فوراً انکار کر دے گا کہ جی کل تو جمعہ ہے نہانا دھونا ہے نماز پڑھنی ہے" ایک مزاحیہ انشائیہ میں نعیمہ جعفری کا قلم لکھتی ہیں:

"وہ ایک نواب صاحب دائم المریض قسم کے آدمی تھے ان کی مزاج پرسی گناہ کبیرہ سے کم نہیں تھی۔ آبائی پیسہ بہت تھا۔ جب آتش جوان تھا تو شرافت کے ثبوت کے طور پر تین شادیاں کر لی تھیں درجن بھر بچے تھے دو بیویاں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ بیٹیاں اپنے گھر بار کی ہوئیں بیٹے اپنی الگ گرہستی لے کر حویلی کے مختلف حصوں پر قابض تھے اور باپ کے پاس

آنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ بڑھاپے میں نواب صاحب نے بیماریوں کا وہم پال لیا۔ شہر بھر کے ڈاکٹروں، حکیموں، ویدوں اور ہومیو پیتھوں سے ان کے معالجانہ مراسم تھے۔ کئی ایک کے تو گھر کا خرچ ہی نواب صاحب کی جیب سے چلتا تھا۔ ایک مرتبہ شہر میں لندن سے کوئی انگریز ڈاکٹر آیا۔ بڑا شہرہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے ایک خوراک میں مردہ بستر سے اٹھ کر کرکٹ کھیلنے لگتا ہے۔ نواب بھلا کیونکر پیچھے رہنے والے تھے۔ انگریز ہمیشہ سے ہندوستانی نواب راجاؤں کی دولت لوٹنے کے لیے مشہور رہے ہیں چنانچہ تین گنا فیس پر ڈاکٹر فوراً راضی ہوگیا ٹوٹی پھوٹی کام چلاؤ ہندوستانی جانتا تھا۔ نواب صاحب کے سکریٹری کے ساتھ ڈاکٹر صاحب آئے نواب صاحب نے حال سنانا شروع کیا' بس جناب کیا بتاؤں دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا ہے لیکن رات کاٹے نہیں کٹتی۔ کل رات ہی کی بات لے لیجیے ریاح نے ناک میں دم کر دیا دائیں طرف چڑھا ایک ٹیس سی ہوئی میں نے دایاں پہلو دبایا تو وہ بائیں جانب کو گیا دل میں ایسا درد اٹھا کہ میں تڑپ گیا۔ دوسرے ہاتھ سے بایاں پہلو پکڑا تو وہ اوپر چڑھ گیا جناب سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے دم اب نکلا کہ تب نکلا۔ بیگم نے سینہ سہلایا تو وہ پیٹ کی طرف رجوع ہوگیا۔ وہ دھما چوکڑی مچائی کہ الامان الحفیظ گرم پانی کی بوتل سے سنکائی کی تو وہ گردوں کی طرف کھسک گیا کبھی ٹانگ میں تو کبھی پیٹھ میں جناب ہجر کی رات کیا طویل ہوگی جو گذشتہ رات تھی کسی طور پر ختم ہونے میں نہیں آتی تھی بیسوں ادویات کھالیں لیکن افاقہ نہیں ہوا۔

ڈاکٹر صاحب بڑے غور سے سن رہے تھے نواب صاحب کو تسلی دی کہ وہ ریاح کو گرفتار کر کے ہی دم لیں گے اور سکریٹری کو اشارہ کر کے باہر آئے اور پوچھا

"ویل یہ ریاح کون ہوتا ہے"

سکریٹری کی نہ اردو اچھی تھی اور نہ انگریزی۔ اٹک اٹک کر بولے۔

نواب صاحب کا ویری اولڈ اینمی (Enemy) ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا" واچ مین کو بلاؤ۔ چوکیدار ہانپتا کانپتا آیا کہ کیا غلطی ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈانٹ پلائی۔

" تم لوگ کا ہے کا Pay لیتا ہے رات بھر نواب صاحب کو ریاح ٹربل کرتا ہے تم لوگ کے ہوتے وہ اندر کیسے آجاتا۔" پھر سکریٹری سے بولے' ہم دو لاکھ کے دے گا پر تم واچ مین کو بدلو۔ کل سے نواب صاحب کے روم تک نہیں پہنچنے کو مانگتا۔"

ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے اپنے ایک انشائیہ' ہماری غائب دماغیاں' میں اپنا ہی ایک واقعہ رقم کیا ہے وہ لکھتی ہیں:' ایک مرتبہ تو ہماری غائب دماغی نے رکارڈ ہی توڑ دیا یہ بھی ایک شادی کا واقعہ ہے۔ ہوا یوں ہمارے بہت ہی عزیز قریبی تعلقات والے پڑوسی کے بیٹے کی شادی تھی اور شرکت نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شوخی قسمت کہ ہمیں چند روز سے بخار چل رہا تھا نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن کریں تو کیا کریں خیر مع اہل وعیال ہم لوگ شادی کے لیے تیار ہوگئے عین وقت پر یاد آیا کہ شادی والا رنگین لفافہ تو ہے نہیں ہم نے ایک سفید لفافے میں نذرانہ رکھ کر دولہا دلہن کے گھر والوں سے ملاقات کر کے اپنا لفافہ دے کر گھر چلے آئے۔ اگلے ہی دن صبح صبح اطلاعی گھنٹی بجی باہر جا کر دیکھا تو پڑوسن کا نوکر ایک لفافہ لیے کھڑا تھا ہم نے کھول کر دیکھا تو ہمارے خون کے ٹیسٹ کی رپورٹ تھی۔ حیران پریشان ہم نے پرس کھول کر دیکھا تو نظر کے شگون کا لفافہ وہاں موجود تھا یعنی ہم غائب دماغی میں منہ دکھائی میں دلہن کو اپنی بلڈ رپورٹ دے آئے تھے اف مارے شرمندگی کے ہم عرصہ تک پڑوسن سے آنکھ چراتے رہے بعد میں میاں کے ہاتھ شگون والا لفافہ بھجوایا۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری کی تصنیف' یادیں اور باتیں' ان کی پوری زندگی کی یادوں کا خزانہ ہے۔ مصنفہ نے اپنی سنہ پیدائش کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ تاہم ان کی تحریر یہ بتاتی ہے کہ ان کی یادوں کا یہ ذخیرہ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ ماضی کی یادیں خواہ تلخ ہوں یا شیریں لیکن اس کا تسلسل حال اور مستقبل کے ساتھ اس طرح جڑا ہوتا ہے جیسے زنجیر کی کڑیاں حال اگر خوشگوار ہے تو انسان مستقبل سنوارنے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر حال پریشان کن ہے تو وہ ان پریشانیوں کا سبب اپنے ماضی میں تلاش کرتا ہے۔ خوشگوار یادیں انسان کو سرشار کرتی ہیں اور غمگین یادیں اداسی کا سبب بن جاتی ہیں۔ نعیمہ جعفری نے اپنی زندگی کے گزرے ہوئے سارے حالات وواقعات کو رقم کرنا اپنا نصب العین تصور کرلیا ہے۔ انھیں باتوں اور یادوں کو تحریری شکل دے کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا ہے اس کے باوجود بھی ڈاکٹر نعیمہ جعفری کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک حساس انسان کی زندگی میں بچپن سے لے کر مرتے دم تک یادوں کے چراغ ہمیشہ روشن رہتے ہیں جنھیں وہ چاہ کر بھی بجھا نہیں پاتا۔

□□□

Dr. Obaidullah Chaudhary
313, Basantpur, P.O. Gita Press
Gorakhpur-273005 (U.P)
Mob: 9235895921

ڈاکٹر قسیم اختر

انسانی کلیوں کی داستان 'جوہی کی کلی'

نیلوفر پروین کے افسانوی مجموعہ ''جوہی کی کلی'' کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے ادبی موشگافیوں اور تحریکی نظریات کے اظہار میں اعتدال کا رویہ اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کسی نظریے میں شدت نظر نہیں آتی ہے۔ انھوں نے تانیثیت سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی عورتیں جری نظر آتی ہیں، مگر انھوں نے عورتوں کو احتجاج کا پتلا نہیں بنایا ہے کہ ہر عورت تیر وتفنگ کے ساتھ میدان میں آجائے۔ اسی طرح انھوں نے علاقائی اور دیہی اثرات کے اظہار پر بھی توجہ دی ہے، مگر انھوں نے علاقائی اثرات سے افسانوں کو اس قدر گنجلک نہیں بنایا کہ ترسیل وتفہیم کا مسئلہ پیدا ہو جائے۔ ان کی اعتدال پسندی کی یہ بھی مثال ہے کہ انھوں نے زبان کے معاملے میں تشبیہ واستعارے کو اس طرح لازم نہیں جانا کہ ان کے بغیر اظہار ممکن ہی نہیں ہو، بلکہ انھوں نے اپنی زبان میں شاعرانہ احساس دلایا ہے اور مثالی نثر کا بھی نمونہ پیش کیا ہے۔ گویا نیلوفر پروین کے افسانوں کی اعتدال پسندی ایک اہم عنصر ہے۔

میں اس کا قطعاً روادار نہیں ہوں کہ ادب کو علاقائی تناظر میں قید کیا جائے، تاہم ہماری زندگی جس طرح ادوار میں بٹی ہوئی ہے اسی طرح ایک ادیب کے ادب کو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی حد تک جغرافیائی حدود کو تقسیم کیا جائے تو کوئی غیر معقول بات نہیں لگتی ہے۔ اس لیے مجھے اتنی بات کہہ لینے میں کوئی عار نہیں کہ نیلوفر پروین نہ صرف خواتین تخلیق کاروں کی صف میں نمایاں نظر آتی ہیں بلکہ سیمانچل کی افسانہ نگاری میں بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ربرسوں سے ایک خطے کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے یہاں نیلوفر پروین کی تمام تر خدمات اور ادبی جہات سے سروکار رکھنا مناسب نہیں ہے، اس لیے پیش نظر مجموعہ ''جوہی کی کلی'' سے ہی مطلب رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس مجموعے میں تقریباً دو درجن افسانے ہیں۔ ان تمام افسانوں پر یہاں کلام ناممکن ہے۔ اس لیے چند افسانوں پر عمومی گفتگو کی جارہی ہے، تاکہ نیلوفر پروین کا ادبی رویہ سامنے آسکے۔ ''جوہی کی کلی'' میں شامل افسانوں کا مزاج اور موضوعات مختلف ہیں۔ ذیل میں چند افسانوں پر سرسری نظر ڈالتے چلیں:

''اجنبی دوست'' ایک بہترین افسانہ ہے جو لو میرج اور ارینج میرج کے درمیان کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجنبی دوستی بھی اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اس افسانے میں جاوید نامی ایک فرد سائرہ کو

فون کرتا ہے اوراس فرد سے سائرہ کو اپنائیت کا احساس ہونے لگتا ہے، تاہم وہ کچھ پریشان بھی رہتی ہے کہ وہ اجنبی ہے تو کون؟ یہ عقدہ اس وقت کھلتا ہے جب فرزانہ کے یہاں منعقد ہونے والی پارٹی میں جاوید اور سائرہ دونوں ملتے ہیں۔ جاوید سائرہ کا بھائی ہے۔ سائرہ فرزانہ کی سہیلی ہے اور یہ سہیلی بھابی بننے جارہی ہے۔ اس افسانے میں پرانی روایت کی پاس داری بھی ہے اور نئے مزاج کی شمولیت بھی۔ ساتھ ہی پسند کی شادی کا احساس بھی۔ وہ اس طرح کہ فرزانہ اوراس کی ماں کو معلوم ہے کہ جاوید نے سائرہ کو پسند کرلیا ہے۔ تاہم سائرہ نے جاوید کو پسند کیا یا نہیں، یہ کسی کو معلوم نہیں ۔لیکن سائرہ نے خود فرزانہ سے کہہ دیا کہ فون کرنے والے اس اجنبی میں وہ کشش محسوس کرتی ہے۔ جب اس کشش کا انکشاف ہوا تب فرزانہ نے سائرہ کے سامنے اپنے بھائی جاوید کی بات رکھی۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس افسانے میں نیلوفر پروین نے شادی کے متعلق پرانی اور نئی قدروں کی پاس داری کی ہے۔ اس پاس داری میں نئی پرانی تہذیب کا تصادم پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہی ان کی فن کاری ہے کہ انھوں نے پرانی قدروں اور نئی آہٹوں کو تصادم آشنا نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنی فن کاری سے دونوں کو سماجی اعتبار سے مفید تسلیم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کی اہمیت دو چند ہوجاتی ہے۔

"دائروں کے بیچ" اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے۔ کیوں کہ اس میں ذات پات کی سماجی بندشیں اور پردے کے پیچھے ہونے والی کہانی کا سچ سامنے آتا ہے۔ وہ اس طرح کہ انسان دو زندگی جیتا ہے۔ ایک زندگی سماج کے سامنے ہوتی ہے اور دوسری زندگی کو سماجی نظر سے چھپایا جاتا ہے۔ اس افسانے میں نیلو پروین نے اسی انسانی مزاج کی عکاسی کی ہے۔ کیوں کہ اعلیٰ ذات کے لوگ جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر کسی سے قریب ہوجاتے ہیں، تاہم سماجی اسٹیٹس کو برقرار رکھنے اور لوگوں کے سامنے اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے ڈھونگ رچاتے رہتے ہیں۔ اس افسانے میں جہاں اس ڈھونگ کا فلسفہ موجود ہے، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ افسانے میں چھوٹی ذات سے ایک بڑے خاندان کا تعلق محض ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ دونسلوں کی کہانی ایک ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ کیوں کہ ٹھاکر رام سنگھ (اجیت سنگھ کا دوست) کا تعلق پونم کی ماں سے تھا اور پونم سے رنجیت سنگھ کے بیٹے اجیت کا تعلق ہے۔ گویا دونسلوں کے مسئلے کو پیش کر کے نیلوفر پروین نے ایک بہترین افسانہ تیار کیا ہے۔ اگر یہ افسانہ اکہرے بیانیہ پر مبنی ہوتا تو شاید اس قدر دل چسپ نہیں ہو پاتا مگر انھوں نے دونسلوں کے مسئلے کو کہانی کا حصہ بنادیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ سوالیہ آہنگ کے ساتھ بہترین افسانہ بن گیا ہے۔

اس افسانے کی فن کاری اپنی جگہ، تاہم انھوں نے دونوں نسلوں کے درمیان جو تفریق دکھائی ہے وہ بھی اہم ہے۔ کیوں کہ رام سنگھ نے پونم کی ماں سے رشتہ رکھا تھا اور اس کو چھپایا گیا مگر اجیت نے پونم سے رشتہ رکھا اور اس کا برملا اظہار کیا۔ اس بیانیہ سے دونسلوں کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیلوفر پروین نے اس افسانے میں ایک سوال بھی قائم کیا ہے اور نئی نسل کی ذہنیت کو پیش کیا ہے۔ اس لیے یہ افسانہ اپنے آپ میں ایک اہم افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بنت میں داخلیت اور خارجیت کا پہلو بھی ہمیں مائل کرتا ہے:

> "اگلی شام حسب معمول پہاڑی سے بہتی ہوئی پرشور ندی کے کنارے پونم اجیت کی منتظر تھی۔ لیکن آج اس کے سینے میں بھی ندی کی طرح شور مچ رہا تھا۔ کبھی وہ کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ کر اس پگڈنڈی کو دیکھتی جہاں سے اجیت کو آنا تھا، اور کبھی نیچے اتر کر مضطرب سی ٹہلنے لگتی۔ آخر تھک کر وہ ندی کے کنارے بیٹھ گئی اور اپنے پیروں کو ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا۔" (دائروں کے بیچ، ص28)

اس اقتباس میں ہم محسوس کرسکتے ہیں کہ نیلوفر پروین کا بیانیہ کس قدر مضبوط ہے اور کس طرح وہ منظر اور پس منظر کو ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پرشور ندی کو پونم کی داخلیت سے جوڑ کر ایک معنی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ معنی کرب سے جڑا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کرب اور فطرت کو یکجا کر کے طمانیت کا بھی احساس دلایا گیا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس افسانے کے بیانیے میں معنی کی کئی جہات ہیں اور متعدد سماجی اطوار اس میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ایک افسانہ "جنم جنم کے ساتھ" بھی اہم ہے۔ کیونکہ اس میں لو جہاد کا پس منظر غیر محسوس طریقے سے شامل کیا گیا ہے۔ کیوں کہ شیتل کے والد عامر کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس افسانے میں فرقہ واریت تو زہرناکی کے طور پر موجود ہے ہی، ساتھ ہی عامر اور شیتل کے ہلاک ہونے کا مسئلہ بھی اپنے آپ میں قابل ذکر ہے کیونکہ ماں باپ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے ہر کام کرتے ہیں تاہم جب مذہب کا نشہ جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو بات بگڑ جاتی ہے اور جان ومال کا اتلاف بھی انسانوں کو سوچنے پر مجبور نہیں کرتا ہے۔ اس افسانہ میں فرقہ واریت کے ساتھ محبت، انسانی ہم دردی اور خون کا رشتہ بھی ایک ایسے انجام کو پہنچتا ہے

جس پر اظہارِ ندامت بھی ناکافی ہے۔

افسانہ ''جوہی کی کلی'' ایک علامتی افسانہ بھی ہوسکتا ہے اور راست بیانیہ بھی۔ راست بیانیہ کچھ اس طرح کہ مالی کی بیوی کو اس کے کیے کا پھل نہیں ملا۔ پھر یہیں سے علامتی تہہ بھی سامنے آتی ہے۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے اور جس طرح زندگی گذارنا چاہتا ہے، اس طرح وہ عموماً گزار نہیں پاتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی زندگی بھی ہار جاتا ہے۔ اس افسانے میں وہی کیفیت پائی جاتی ہے کہ جوہی کی کلی نہیں بک پاتی ہے تو مالن پریشان رہتی ہے۔ ملول رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ زندگی ہار جاتی ہے۔ گویا خود اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد ایک نوجوان جوہی کی کلی کی تلاش میں آتا ہے۔ یہاں سے نکتہ ہاتھ آتا ہے کہ ابتدائی ناکامی کی آگ میں خود کو جھونک دینا، انصاف کی بات نہیں ہے۔ مالن نے خود کو ہلاک کر لیا مگر جوہی کے پھول کی تلاش میں ایک نوجوان باغیچے تک پہنچ گیا ہے۔ اگر مالن زندہ ہوتی اور وہ نوجوان آجاتا تو مالی کی خوشی بھی دوبالا ہوتی اور باغیچے کی رونق میں بھی اضافہ ہوتا، مگر مالن کی پریشانی نے خود اسے نقصان پہنچایا اور کسی حد تک باغیچے اور مالی کو بھی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وقتی نبرد آزمائی کا مسئلہ انسانی سرشت کو اس قدر نقصان پہنچاتا ہے کہ اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس افسانے سے ایک اقتباس دیکھیں:

> ''جوہی کے پودے کی حالت دیکھ کر مالن اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ اسے جوہی کا پودا سب سے زیادہ پیارا تھا۔ جوں جوں جوہی کا پودا زندگی کی رمق کھوتا گیا، توں توں مالن کمزور اور بیمار ہوتی گئی۔ مالی یہ سب دیکھتا اور خون کے آنسو روتا۔ اس کی دل جوئی کا مالن پر کوئی اثر نہ پڑا۔''

(جوہی کی کلی، ص 64)

اس اقتباس کو مالن کی ہلاکت سے جوڑ کر دیکھیں تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ انسانی فطرت میں فقط انسانوں سے کشش کا ہی مادہ نہیں ہوتا ہے۔ انسان ایک عجیب مخلوق ہے جس کی جمالیاتی حسیت میں غیر انسانی کرداروں کی بھی اہمیت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مالن کو کچھ انتظار کرنا چاہیے تھا، مگر اس کی جمالیاتی حسیت اس کی روح وجان تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے وہ ہلاک ہوئی۔ الغرض اس افسانے میں جمالیاتی حس، وقتی نبرد آزمائی کا مسئلہ، احساس کمتری اور حالات کی خطرناکی سب کچھ موجود ہے۔

''چارہ گر'' نامی افسانہ میں نیلوفر پروین سیاست کی بے حسی اور عوام کی لاپروائی کو مرکزیت دیتی ہیں، تاہم اس میں فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو درد اور زخم دینے والے بھی انسان ہیں اور زخموں پر نمک پاشی کرنے والے بھی انسان۔ گویا انسانی درد کے اضافے میں کسی شیطان یا پھر مخلوقِ دیگر کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے، بلکہ ایک انسان یعنی ایک فرد دوسرے انسان کو درد دیتا ہے۔ پیش نظر افسانہ میں ڈرائیور نے ریشم اور ریحان کے گھرانے کو جو درد دیا، اس درد کو سوا کرنے میں حکومت اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ افسانہ یوں تو اپنے آپ میں ایک فوری ردعمل کا نتیجہ ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اخباری بیان اور حکومتی رویوں کو راست بیانیہ کے طور پر پیش کر دیا گیا، مگر نیلوفر پروین نے ایک مختصر افسانے کی بنت میں کئی واقعات کو یکجا کیا ہے اور ان واقعات میں منطقی ربط بھی پیدا کیا ہے جس کی بنیاد پر اس کا فنی رچاؤ اہم ہوجاتا ہے اور کئی ایک سماجی انسلاکات کے پہلو روشن ہوتے ہیں۔ یہ افسانہ شاہ کار نہ سہی، اپنے موضوع سے ضرور انصاف کرتا ہے اور انسانوں کے دہرے رویے اور حکومت کی بے حسی پر ایک خاموش طنز ہے۔ اس افسانے کی زبان بھی ویسی ہی ہے جیسی ان کے دیگر افسانوں کی ہے، تاہم اس میں ''شامیانہ بجنے'' کا استعمال کیا گیا ہے، حالاں کہ شامیانہ بجنے سے کہیں زیادہ ''شادیانے بجنے'' کا استعمال بہتر ہوسکتا ہے۔

یہ سچ بات یہ ہے کہ نیلو پروین کے افسانوں کے بیانیہ میں کسی بھی سطح پر مصنوعی کیفیت کا گمان نہیں گزرتا ہے۔ ہر افسانے میں وہ شائستگی اور بڑی آسانی سے اپنی بات کہہ جاتی ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت اور لفظی انتخاب میں کہیں پر بھی سوقیانہ پن اور ابتذال کی کیفیت نظر نہیں آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کو اپنے اندر گھلایا ہے، اس کے بعد صفحہ قرطاس کو سجایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر افسانے میں بے ساختگی اور رفطری بہاؤ کا احساس ہوتا ہے۔

نیلوفر پروین نے اپنے افسانوں میں فکر وفلسفہ سے کم اور پیش آمدہ مسائل کے تجزیوں سے زیادہ سروکار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک صحافیانہ حسیت پائی جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نیلوفر پروین ماضی پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے مرثیہ خوانی کرتی ہیں اور نہ ہی مستقبل کی فکر میں گھلی جاتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ نیلوفر کا شیوہ حال میں جینا ہے اور حالیہ اسباب ومسائل کا تجزیہ کرنا ہے۔ یہ ہمارے افسانوں کی بد قسمتی رہی ہے کہ ہم ماضی پرستی میں غرق ہوجاتے ہیں یا پھر تخیلاتی اڑان کے سہارے مستقبل سازی کی فکر میں گھلے جاتے ہیں۔ اس روش سے یقیناً حال کی حق تلفی ہوتی ہے۔ نیلوفر پروین نے حال کو پر کشش بنانے کا فارمولہ پیش کیا ہے اور حالیہ احوال کو تخلیقی پیرہن عطا کیا ہے۔

نیلو فر پروین کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے نسائی معاملات کو نسائی لوازمات اور متعلقات کے مدنظر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے عورت کی نازکی اور نازک مزاجی کا پاس ولحاظ رکھا ہے۔ انھوں نے مزاحمتی رویوں سے اس قدر کام نہیں لیا ہے کہ تانیثی پہلو کمزور ہوجائے۔ آج تانیثیت کی حمایت میں لوگ اس قدر متشدد ہوجاتے ہیں کہ عورتوں کی نازکی اور نسائیت مجروح ہونے لگتی ہے اور عورت ہمیشہ برسر پیکار نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیلو فر پروین نے اپنے اسلوب اور انداز سے عورت کے حسن کو مجروح نہیں کیا ہے۔ اس کی نازکی پر آنچ نہیں آنے دی ہے۔

اس کے علاوہ نیلوفیلو پروین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے متوسط طبقے کے اظہار پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ہر عہد میں ایک متوسط طبقہ کے افراد زیادہ ہوتے ہیں اور بیش تر لکھنے والوں کا تعلق بھی کسی نہ کسی سطح پر متوسط طبقے سے ہوتا ہے۔ نیلوفر پروین نے متوسط طبقے کی عکاسی کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ آپ بیتی کو جگ بیتی بناتی ہیں اور جگ بیتی کو فرد بیتی سے جوڑ دیتی ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں میں فرد وسماج کا تصادم عروج پر ہے۔ انھوں نے رقت آمیزی، جذبہ ترحم، انسان دوستی، ذہنی تصادمات، علاقائی معاملات، دیہی تناظرات اور داخلی سرور کار سے خصوصی لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کی کڑیاں موجودہ سماج میں فن کارانہ طور پر مدغم ہیں۔

Dr. Qaseem Akhtar
Assistant Prof.
Dept. of Urdu
Marwari College
Kishanganj-855107 (Bihar)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ / منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما

غزلیں

میں بھی زندہ ہوں یہ احساس دلانے آ جا
پیار کے بجھتے شراروں کو جلانے آ جا

لذت درد سے محروم نہ ہو جاؤں کہیں
دل کے زخموں کو پھر اک بار کھلانے آ جا

کتنی شدت سے یہ گریہ کے لیے ہیں بیکل
میری ترسی ہوئی آنکھوں کو رلانے آ جا

شرف دیدار مجھے بھی تو کبھی ہو حاصل
میری بے خواب نگاہوں کو سلانے آ جا

ڈھونڈتی پھرتی ہوں برسوں سے میں گم گشتہ
وجود
میرے ہمدم تو مجھے مجھ سے ملانے آ جا

رند میخانے میں بیٹھے ہیں سوالی بن کر
اپنی آنکھوں سے ذرا جام پلانے آ جا

توڑ ڈالوں گی میں خود اپنی انا کا بندھن
کاش رسماً سہی شاماؔ کو بلانے آ جا

سانسوں کے زیر و بم سے جھلتا ہے دل مگر
زہراب زندگی کا پیے جا رہے ہیں ہم

یہ زندگی تو اصل میں دشت سراب ہے
پھر کس لیے گناہ کیے جا رہے ہیں ہم

غیرت، انا و ظرف کو مصلوب کر کے بھی
احسان دشمنوں کے لیے جا رہے ہیں ہم

اپنے قصور و عیب پہ مطلق نظر نہیں
الزام دوسروں کو دیے جا رہے ہیں ہم

تیری عنایتوں سے دریدہ ہے یہ بدن
نشتر سے اپنے زخم سیے جا رہے ہیں ہم

اپنوں کے درد و غم کی تو شاماؔ خبر نہیں
خود اپنے واسطے ہی جیے جا رہے ہیں ہم

Dr. Joohi Begum
59C/67C, South Malaka
Prayagraj 211003 (U.P)
Ph. 7985982665

ڈاکٹر مسرور صغریٰ

بین

اک درد کا عنوان ہوں اک قصہ غم ہوں
آہوں کا جگر چاک ہو وہ لہجہ سم ہوں

کس شان سے احساس کو دلہن تھا بنایا
کنگنے میں بندھے پھول کے گہنے کو جلایا

راس آئی نہ مہندی کبھی اشکوں کے لہو کو
وعدے کی نیت توڑ گیا کرکے وضو وہ

جوڑے میں لگے عطر دھوئیں میں ہوئے تحلیل
ٹوٹی یہاں چوڑی تو وہاں رو دیے جبریل

پازیب کی جھنکار سے جو دل میں کھلے تھے
ان پھولوں کے سب خون مقدر میں ملے تھے

اجڑی جو کہیں مانگ تو افشاں نے کیے بین
قلزم میں ملا دو مرے ذرات ملے چین

کاجل تری قسمت بھی سیاہ میری طرح ہے
دامن پہ لگے داغ پہ کیوں نوحہ سرا ہے

سانسیں جو مہکتی رہیں خوشبوئے وفا سے
دشوار تھیں اک آن بھی تیزاب دغا سے

اک آگ جگر میں ہے نظر میں ہے تلاطم
اچھا ہے رہو اور بھی کچھ روز خفا تم

صدموں کو تہہ خاک چھپائیں کہو کیسے
ارمانوں کو لوری تو سنائیں کہو کیسے

خائف رہوں کیسے کہ مرے منہ میں زباں ہے
مت سوچ سیاہ حرف ہے تحریر کماں ہے

اے رات مرے خواب ہیں تعبیر سے مجروح
کتنے ہیں بتا زد میں تری تیر سے ابرو

گھر کتنے اجاڑے گا اے ظالم یہ بتا تو
جبڑے تری لالچ کے ہیں سالم یہ بتا تو

جب ظلم کے سینے میں اتارا گیا خنجر
اجداد کی نسلیں تری ہوجائیں گی بنجر

اب صبر کا پیمان لرز جائے تو اچھا
ایجاب ترا حد سے گزر جائے تو اچھا

چہرے سے نقابیں جو اتر جائیں تو اچھا
فتنے کی طنابیں یہ اتر جائیں تو اچھا

اچھا ہو جو طوفان ہے شورش کا وہ ٹل جائے
رسمیں جو ہیں دلہن کو جلانے کی وہ جل جائیں

Dr. Masroor Soghra
Assistant Prof. (Guest Faculty)
C M College
Quilaghat, Rahamganj
Darbhanga-846004 (Bihar)

ہاتھ کی لکیریں

شیریں نیازی

تم لوٹ آئے رمضو—؟

پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک اٹھا اور پوچھنے والے کو یہ پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ ان دنوں رمضو کی حالت ایسی ہے ہوگئی تھی۔ کچھ سوئی کچھ جاگی سی۔ وہ چہرے بھولنے لگا تھا۔ جاگتے میں بھی ایسے گم ہوجاتا جیسے سو رہا ہو۔ سوئے میں کچھ سویا کچھ جاگا سا۔

رمضو رمضان کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد۔ اس سے پہلے اس کے تین بھائی بہن پیدا ہوکر مر چکے تھے۔ پیدائش کے بارہ سے چوبیس گھنٹوں کے اندر۔ تب اس کی ماں در در بھٹکتی پھری تھی تعزیے کے چوک پر چراغ جلائے تھے درگاہ درگاہ فریاد کی تھی۔ ملا اور پنڈتوں کے پیر چھوئے تھے۔ تب جا کر وہ پیدا ہوا اور جیا تھا۔ کسی اولاد والے نے اسے پانچ کوڑیوں میں خریدا بھی تھا۔ اس لیے لوگ اسے پنچ کوڑی یا پنچ کوڑیا پکارا کرتے تھے۔ دادی اسے دن بھر میں تین بار تیل مالش کیا کرتی۔ دادا اپنی گود میں لٹا کر منہ میں کشمش کے دانے کھلایا کرتے۔ بابا ایک کوئلہ کمپنی میں کوئلے لوڈنگ کا کام کرتے تھے۔ وہ بہت ایماندار مزدور تھے۔ اس لیے ان کے پاس پیسے کم تھے بس عزت کی روٹی مل جاتی تھی۔ چھ کمروں والا ایک سیدھا سادہ گھر تھا۔ اس گھر کے مکینوں میں دادا، دادی ماں بابا اور ایک ماما اور ایک پھوپھی تھی۔ جس کی عمر شادی کے لائق ہو چلی تھی۔ میٹرک پاس کر کے انٹر میں داخلہ لیا تھا اس کے بھی کچھ خواب تھے کچھ بننا چاہتی تھی۔

ماما بھی تب تک ان کے ساتھ رہے جب تک ان کی پڑھائی پوری نہیں ہوئی۔ رمضو کے ناز نخرے اٹھاتے رہے۔ بہن بہنوئی کی خدمت کرتے رہے۔ اس وقت اس کی عمر چار سال کی رہی ہوگی جب وہ ماما کے تھیلے میں بیٹھ جاتا اور ماما پورے بازار میں سبزی کی طرح جھلائے پھرتے۔ تھیلے کے اندر سے اس کا سر باہر ہوا کرتا اور تھیلے میں بیٹھ کر بازار کا نظارہ دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا۔ پھر جب تھیلے میں سبزیاں بھر جاتیں تو اس کی سواری ماما کے کندھوں پر ہوتی۔

لیکن ایک دن روزی کی تلاش میں ماما کو باہر نکلنا ہی تھا۔ ان کی شادی ہونی تھی۔ بچے آنے تھے۔ سو سب سے اجازت لے کر وہ اپنی منزل کی تلاش میں راونہ ہو گئے۔

اس رات رمضو بہت رویا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ رمضو بڑا ہوتا گیا۔ ماما کی نوکری لگ گئی۔ لیکن بہت دور......ٹرین سے پورے تین دن کا سفر۔ اس وقت موبائل نہیں تھا۔ مگر ٹیلیفون پر برابر حال پوچھا کرتے۔ اس کے اسکول کی فیس وہی بھیجا کرتے۔ پھوپھی کی شادی کے لیے بھی بہت سا سامان اور پیسے لیکن اس طرح کب تک چلتا؟ مہنگائی بڑھتی گئی۔ بابا زیادہ سے زیادہ محنت کرنے لگے لیکن ان کا جسم اب کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ ان کی پونجی اب بھی ایک گھر اور ایک پرانی سائیکل کے سوا کچھ نہ تھی! کڑکڑاتے جاڑوں میں نائٹ شفٹ ڈیوٹی کرنے اسی سائیکل پر جایا کرتے۔ ان کا ہیلپر آرام کرتا اور ضرورت پڑنے پر دانتوں سے ٹارچ پکڑ کر اکیلے کام کیا کرتے۔ ایسے میں ایک رات ان کا پیر پھسل گیا اور ہاتھی سے زیادہ اونچی گاڑی پر سے نیچے گر گئے ایک بہت بڑا پتھر ان کے نچلے دھڑ کے اوپر لڑھک گیا۔ چھ مہینے تک ہسپتال میں پڑے رہے۔ گھر آنے کے بعد مشکل سے ایک سال تک جی پائے جو تھوڑی سی جمع پونجی تھی وہ بھی ختم ہو گئی رمضو اس وقت بالغ نہیں ہوا تھا۔ باپ کی جگہ پر نوکری کرنے کے لیے۔ اٹھارہ برس کی عمر ہونی چاہیے تھی۔ اس لیے اس کی ماں کو نوکری کرنی پڑی لوگوں نے بہت تنازعہ کھڑا کیا۔ ایک پردہ دار عورت باہر جا کر مردوں کے روبرو کام کرے یہ ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ لیکن کوئی یہ بھی کہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا کہ ''تم گھر میں بیٹھو ہم تمھارا خرچ پورا کریں گے۔''

''کسی چچیرے ممیرے کو نوکری دلا دینے کا مطلب تھا ان کے در کا بھکاری بن جانا۔'' نہیں— میں خود کام کروں گی۔''

اور پھر اس نے ڈیوٹی جوائن کرنے کی عرضی ڈال دی کاغذات پر اس کا نام تو تھا ہی کچھ دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اسے منزل مل گئی۔ گرچہ اس کا اپوائنٹمنٹ اس کے شوہر کے مقابلے آدھے پیسے پر ہوا تھا لیکن وہ کسی اور کی محتاج نہیں تھی۔

دادا دادی اب کافی ضعیف ہو چکے تھے اور رمضو ہٹا کٹا نوجوان۔ پورے دس برس تک ماں نے دن رات محنت کی تھی۔ گھر اور باہر کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا۔ اب اس کے ہاتھ پیر جواب دینے لگے تھے اور رمضو جوان ہو چکا تھا۔ ماں چاہے تو وقت ہو جانے پر اپنی نوکری بیٹے کو دے سکتی ہے۔ کچھ آفیسروں نے ماں کی مدد کی اور رمضو کے نام کا لیٹر بن گیا۔ ماں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بہو لانے کے خواب سجانے لگی۔ گرچہ رمضو ابھی شادی کے لیے تیار نہیں تھا مگر ماں کے آنسوؤں نے مجبور کر دیا۔ دادا دادی شاید اسی دن کا انتظار کر رہے تھے۔ گھر میں پوتے کی بہو آ گئی ان کے چہرے کی جھریاں مسکرا اٹھیں۔

ماں نے ، بیوی نے ، دادا دادی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا، اس سے اب اپنے گھر والوں کی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ماں دادا، دادی سب کو بڑے سلیقے سے قائل کر لیا۔" تھوڑے دنوں کی تو بات ہے ماں، دو تین سال چٹکیوں میں گزر جائیں گے۔" سوچو تو۔ اگر مجھے اور بچوں کی طرح پڑھائی کے لیے کہیں باہر جانا ہوتا تو کیا تم پڑھائی بند کرا دیتیں؟ تم نے کتنے دکھ جھیلے، کیا تم چاہو گی کہ تمھاری بہو اور ہمارے بچے بھی ایسے ہی تکلیفیں اٹھائیں؟ کل کو تمھارے پوتے پوتیوں کو کھانا نہ ملے۔ وہ جاہل رہ جائیں۔؟"

انھیں دنوں یہ خبر پھیلی کہ کمپنی گھاٹے میں جا رہی ہے۔ چھ مہینے تک مزدوروں کو آدھی سیلری ہی مل پائی۔ اب لوگوں کے لیے اپنا گھر چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی جن کے پاس کچھ آمدنی کا ذریعہ تھا وہ حالات بہتر ہو جانے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن جن کے پاس اور کوئی ذریعہ نہ تھا وہ ادھر ادھر دیہاڑی مزدوری پر نکل پڑے۔

لیکن رمضو کو اپنے خواب بکھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ نہ جانے کہاں سے ایک جیوتشی مل گیا تھا جس نے اس کے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ کر بتایا کہ ان لکیروں میں ''ودیش کا یوگ ہے۔''

ماں نے، بیوی نے، دادا دادی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا، اس سے اب اپنے گھر والوں کی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ماں دادا، دادی سب کو بڑے سلیقے سے قائل کر لیا۔ ''تھوڑے دنوں کی تو بات ہے ماں، دو تین سال چٹکیوں میں گزر جائیں گے۔'' سوچو تو۔ اگر مجھے اور بچوں کی طرح پڑھائی کے لیے کہیں باہر جانا ہوتا تو کیا تم پڑھائی

بند کرادیتیں؟ تم نے کتنے دکھ جھیلے، کیا تم چاہو گی کہ تمھاری بہو اور ہمارے بچے بھی ایسے ہی تکلیفیں اٹھائیں؟ کل کو تمھارے پوتے پوتیوں کو کھانا نہ ملے۔ وہ جاہل رہ جائیں۔؟''

ماں یہیں ہار گئی اور اپنے اچھے خاصے گھر کو گروی رکھ کر اس کے لیے کرائے کے پیسے جٹائے اور وہ نکل پڑا انجانی راہوں پر۔ ہاتھ کی لکیروں کے سہارے۔

بہت دوڑ دھوپ کے بعد اسے جو نوکری ملی وہ اونٹوں کی دیکھ بھال کا کام تھا۔ رمضو بہت رویا مگر ہمت کر کے لگ گیا۔ کچھ نہیں سے کچھ بھلا— اونٹوں کے مالک کے ایک دوست کو اس سے ہمدردی ہوگئی۔ اس کی تسلی بخش باتوں نے رمضو کو سنبھال دیا۔ کوشش کر کے ایک پرنٹنگ پریس میں لگوا دیا۔ مشین چلانے کی ٹریننگ کے دوران کئی بار اسے بھوکے رہنا پڑا— ایسے میں ماں کے ہاتھ کی کھری کھری سوندھی روٹی اور بھنی ہوئی لال مرچوں کی لہسن کے ساتھ بنی ہوئی چٹنی بہت یاد آتی تھی— اسی طرح ڈیڑھ سال گزر گئے اچھے پیسے ہاتھ میں آ جانے سے اس کے چہرے کی چمک بڑھ گئی تھی وہ پابندی سے گھر میں ماں کے لیے اور بیوی اور دادا دادی کے لیے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ڈالتا جا رہا تھا۔ گھر کی حالت سدھرنے لگی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔ کئی دن رمضو بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش میں آیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی سب سے قیمتی چیز کھو چکا ہے۔ سب کچھ پلٹ چکا تھا۔ تین مہینے ہسپتال میں رہنے کے بعد جب نکلا تو اس کے ہاتھوں کی لکیریں مٹ چکی تھیں۔ کمپنی کی طرف سے معاوضے کی شکل میں پیسے ملے تو تھے لیکن ان پیسوں سے پوری زندگی تو نہیں گزاری جا سکتی؟ اس نے خود کو بالکل ٹوٹا ٹوٹا سا محسوس کیا۔ ساری راہیں بند ہو چکی تھیں۔ اسے آج بدھوا کی یاد آ رہی تھی جو بنا پوچھے سبھوں پر اپنی رائے لادا کرتا تھا۔ سب سے زیادہ رمضو ہی اس سے چڑھا کرتا تھا آج اسے بدھوا کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی وہ یہاں ہوتا تو کوئی راستہ بتاتا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس انجانے دیش میں اپنے سارے خواب دفن کر کے اسے لوٹ آنا پڑا۔

اور اب وہ اپنی اسی پرانی جگہ پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دور دور تک کوئلے کے اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ نیچے کھلی کان میں بڑی بڑی گاڑیاں چل رہی تھیں ہزاروں مزدور کام میں لگے ہوئے تھے زندگی ایک بار پھر چل نکلی تھی———

اوپر سے اس نے نیچے کی طرف دیکھا تو گاڑیاں بونی بونی سی اور مزدور بالشت سے نظر آ رہے تھے۔

''جب میں خود انھیں گہرائیوں میں اتر کر کام کیا کرتا تھا تو اوپر والوں کو میں بھی تو چھوٹا ہی نظر آتا ہوں گا۔ یہ سوچ کر وہ اپنے آپ ہی ہنس پڑا۔

ٹھیک اسی وقت سیٹی بج اٹھی۔ شاید بلاسٹنگ ہونے کو تھی۔

''ارے...... بھاگو۔ ہٹو دور ہٹ جاؤ۔ کوئی چلایا تھا۔

''کوئی نیا آدمی معلوم ہوتا ہے'' کسی اور نے کہا۔ وہ تب تک دور ہٹ چکا تھا۔

بلاسٹنگ کی آواز کے ساتھ کوئلے کی ایک چٹان ٹوٹ گئی تھی، سارے مزدور اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے اب شام ہونے کو تھی جاڑوں کے موسم میں رات جلدی آ جاتی ہے۔ وہ پلٹ کر چلنے کو ہوا ہی تھا کہ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔

''تم لوٹ آئے رجو۔ اچھا ہوا۔ دیکھو دیکھو کمپنی پھر چالو ہو گئی ہے اور وہ خوشی سے چلانے لگا۔

''ارے اور گھو۔ ارے سمرا۔ پلوؤ...... دیکھو۔ ہمرا رجو لوٹ آیا ہے'' دیکھو دیکھو کتنا سندر لگ رہا ہے۔ ہٹا کٹا جوان۔ بدھوا خوشی سے ناچنے جیسا ہو گیا تھا۔

''رمضو تو لوٹ آیا ہے۔ بدھوا۔ لیکن تیری بات نہیں مانی تھی نا اس لیے اپنی سب سے قیمتی چیز کھو آیا ہوں۔ کہتے کہتے اس نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکال کر ان کے سامنے کر دیے۔

''اب میرے ہاتھوں میں کوئی لکیریں نہیں بچی بدھوا...... وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ بدھوا نے اپنے گلے سے لگا لیا۔

''تم لوٹ آئے یہی سب سے بڑی بات ہے۔ ماں کو بیٹا اور بیوی کو شوہر مل گیا۔

''سنو آج جو کہہ رہا ہوں۔ لیکن پہلے کینٹین میں چل کر چائے پیتے ہیں''

بدھوا نے چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمھارے پاس کچھ پیسے تو ہوں گے۔ اگر گھر چھڑانے بھر ہیں تو سب سے پہلا کام یہی کر لو۔ اس میں پورے چھ کمرے ہیں۔ تین کمرے کرائے پر لگا دو۔

''لیکن گھر چھڑانے میں پیسے خرچ کر دیے تو کھائیں گے کیا؟

□□□

Mrs. Shireen Niyazi
Teacher's Colony
River Side, Bhurkunda
Ramgarh-829135 (Jharkhand)

نیت

طلعت فاطمہ

صادقہ میرے پڑوس میں چند سال قبل اپنی فیملی کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہنے آئی تھی۔ وہ طلاق شدہ تھی۔ اس کی فیملی میں اس کے والدین کے علاوہ اس کی ایک چھوٹی سی بیٹی تھی۔ ایک بھائی بھی تھا لیکن وہ اپنی دنیا میں مست آوارہ گردیوں میں روز و شب بِتا تا لہٰذا گھر کی کفالت کی ذمہ داری صادقہ کے سر تھی۔ گو کہ صادقہ اور اس کی فیملی معاشی طور پر پسماندہ تھی لیکن صادقہ کو میں نے ہمیشہ چمک دمک اور بھڑکیلے لباس میں دیکھا۔ میرے گھر کے سامنے ہی بس اسٹاپ تھا لہٰذا ہر روز اس کی آمدو رفت پر میری نگاہ اس پر پڑتی اور دھیرے دھیرے ہم دونوں میں رسمی سی شناسائی ہوگئی لیکن میری کوشش ہمیشہ یہی رہتی کہ میں اس کی طرف دیکھنے سے اجتناب کروں کیونکہ اس کے متعلق میرے خیالات اچھے نہیں تھے اس لیے میں اس سے راہ و رسم بڑھانے سے گریز ہی کرتی حالانکہ اس کی نظر جب بھی مجھ سے ملتی وہ نہایت گرم جوشی سے مسکراہٹ کا تبادلہ کرتی اور جواباً میں رسمی سی مسکان کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے نظروں کا زاویہ پھیر لیتی۔ غرض کہ اسی طرح روز و شب گزرتے رہے اور رمضان المبارک کا بابرکت اور رحمتوں والا مہینہ شروع ہوگیا۔ ہر طرف فضا میں قرآن مقدس کی دل سوز آوازیں روح و دل کو ایک الگ سی تقویت عطا کر رہی تھیں اور روزہ، نماز اور دیگر نفلی عبادات ایک الگ سی سرشاری کے حصار میں مقید رکھتیں۔

پہلا عشرہ مکمل ہونے کو آیا۔ میں باورچی خانے میں افطاری کی تیاریوں میں منہمک تھی۔ میرے دونوں بچے اسکول سے آکر کھیل کود میں لگے تھے اور شوہر بھی دفتر سے آنے کے بعد عصر کی نماز پڑھ رہے تھے تبھی ڈور بیل بجی اور میں جو پکوڑے بنانے کے لیے بیسن پھینٹ رہی تھی جلدی سے سِنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے دروازہ کھولنے گئی اور جوں ہی دروازہ کھولا صادقہ کو اسی طرح بنے سنورے، چست لباس اور میک اپ زدہ چہرے کے ساتھ دروازے میں پایا۔ میرے چہرے پہ سرخی دوڑ گئی اور دماغ کا پارہ اوپر چڑھنے لگا تبھی وہ التجائیہ انداز میں کہنے لگی کہ عائشہ باجی مجھے ایک بوتل ٹھنڈا پانی دے دیں۔ سخت گرمی کی وجہ سے آج حالت بہت خراب ہوگئی۔ ابھی کام سے لوٹتے ہوئے سوچا آپ سے مانگ لوں۔ یوں تو کبھی ہماری بات نہیں ہوئی لیکن آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں" میں جو اسے سخت سست کہنے کا سوچ رہی تھی اس کی طلب جان کر خاموش ہوگئی اور اسے اندر آنے کا کہے بغیر کہ یہ میری دین دار طبیعت کے برخلاف تھا کہ اس کے ایسے حلیے میں، میں اسے اپنے شوہر کی موجودگی میں اندر آنے کی اجازت دیتی سو اسے دروازے پہ چھوڑ کر ہی فریج سے پانی کی بوتل نکال کر اس کے

تھوں، میں تھمادی اور ابھی دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ میں یہ دیکھ کر لق دق رہ گئی کہ وہ سامنے کوریڈور میں لگے بنچ پر بیٹھی ایک ہی سانس میں پانی کی بوتل غٹا غٹ پی رہی تھی اور میں جو پہلے اس خیال کے تحت کہ دھوپ سے آنے کی وجہ سے افطاری میں وہ مشروب بنانے کی غرض سے ٹھنڈا پانی لینے آئی ہے تھوڑی نرم پڑی تھی، میرا دماغ پھر سے بے قابو ہوا اور وہ جوں ہی پانی کی خالی بوتل میری طرف لوٹانے کے لیے آگے بڑھی، میرے چہرے کے سخت تاثرات دیکھ کر جواز پیش کرتے ہوئے کہنے لگی کہ وہ باجی میری طبیعت خراب تھی نا اس لیے روزے سے نہیں ہوں۔ میں نے کچھ جواب دیے بغیر اس کے ہاتھ سے بوتل لی اور دروازہ بند کرتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئی۔

عید آنے میں بس ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ مجھے شاپنگ بھی کرنی تھی۔ کچھ کاروباری مسائل کی وجہ سے اسد کو تنخواہ دیر سے ملی تھی لہٰذا اتوار کے دن ہم سبھی شاپنگ کے لیے نکل گئے۔ وہاں جب ایک مال میں پہنچے تو دیکھا کہ لیڈیز سیکشن کی طرف صادقہ اسی طرح چست لباس اور گہرے میک اپ کے ساتھ کولڈ ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے سِپ لے رہی تھی اور کسٹمرز کے آتے ہی وہ کولڈ ڈرنک سائیڈ رکھ کر انھیں سامان کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسد سے بیزار لہجے میں کہا کہ چلیے یہاں سے، کہیں اور چلتے ہیں تو انھوں نے میری بیزاری کا سبب جاننا چاہا تو میں نے خاموشی سے انھیں نکلنے کا اشارہ کیا تبھی صادقہ کی نظر ہم پہ پڑ گئی اور وہ اٹھلاتی ہوئی ہمارے سامنے آن موجود ہوئی۔ اس نے با آواز بلند گرم جوشی سے ہمیں سلام کیا اور اسد نے اس کے سلام کا جواب خوش دلی سے دیا جبکہ میں نے اسے نظر انداز کرنے کی بھرپور اداکاری کی۔ وہ میرے دونوں بچوں کا ہاتھ تھامے انھیں کِڈ سیکشن کی طرف لے جا ہی رہی تھی کہ دفعتاً میں نے سختی سے اس کے ہاتھوں سے اپنے دونوں بچوں کا ہاتھ چھڑایا اور خود ان کو لیے آگے بڑھ گئی۔ ابھی میں تین سالہ رمشا اور پانچ سالہ احمر کے لیے کپڑے دیکھ ہی رہی تھی کہ صادقہ ہاتھوں میں کولڈ ڈرنک اور بچوں کے لیے چاکلیٹس لیے چلی آئی۔ میرا ضبط جواب دے گیا اور میں نے اس سے سخت لہجے میں کہا کہ تم ذرا مجھ سے اور میری فیملی سے دور رہو۔ میں نے اس کے ہاتھوں میں کولڈ ڈرنک اور چاکلیٹس دیکھ کر طنزیہ کہا کہ سب کو خود کی طرح سمجھ رکھا ہے۔ اگر خود روزہ نہیں رکھتی تو کم از کم دوسرے روزہ داروں کا تو احترام کرو اور میری اتنی سخت تنبیہ پہ وہ شرمندہ سی ہو کر کہنے لگی کہ باجی یہ تو میں بچوں کے لیے لائی تھی۔ اس کی توضیح سن کر میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا کہ کوئی ضرورت نہیں مجھ سے اور میرے بچوں سے راہ و رسم بڑھانے کی۔ اسد نے میرے اس روکھے پھیکے انداز پہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں بچوں کا ہاتھ تھامے تیزی سے وہاں سے نکل گئی ناچار اسد کو بھی اٹھنا پڑا اور پیچھے سے صادقہ آواز دیتی ہی رہ گئی۔ گھر آ کر اسد نے مجھ سے اس خراب رویے کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی تو میں نے سختی سے کہہ دیا کہ وہ لڑکی مجھے بالکل پسند نہیں۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی اسلام اور مسلمان کا نام بدنام ہوتا ہے۔ اچھی خاصی صحت مند ہے لیکن روزہ رکھنے میں قیامت ٹوٹتی ہے ان پہ اور ساتھ ہی لباس تو اس طرح زیب تن کرتی ہے کہ مسلمان کے نام پہ دھبہ محسوس ہوتی ہے مجھے۔ اسد نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ یوں کسی کے بارے میں ایسی رائے قائم کرنا درست نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کی کچھ مجبوری ہو جس کی وجہ سے وہ روزہ نہیں رکھ پاتی اور اسد کے یوں اس کی حمایت نے مجھے اور آگ بگولہ کر دیا اور میں ان کی جانب خشمگیں نگاہوں سے دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

آج ستائیسویں کی شب اس لیے سارے کام میں نے دن میں ہی مکمل کر لیے کیونکہ رات مجھے پوری عبادت میں گزارنی تھی۔ تمام کام مکمل کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ کچھ ضروری اشیا رہ گئی ہیں لہٰذا انھیں خریدنے کی غرض سے میں دونوں بچوں کو لیے قریب کے بازار میں چلی گئی۔ وہاں میں نے صادقہ کو دیکھا کہ وہ اپنی ہی طرح کی لڑکیوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں لگی چوڑیاں خریدنے میں مگن تھی۔ وہ سب قہقہے لگا کر ہنس رہی تھیں اور منچلے نوجوان ان پہ عامیانہ فقرے کس رہے تھے۔ تبھی ظہر کی اذان فضا میں ترنم بکھیرنے لگی اور میں اس کی ان حرکات کے متعلق سوچتے ہوئے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہہ رہی تھی کہ اچانک "اشہد انّ محمد رسول اللہ" کی صدا پہ وہ خاموش ہو گئی اور کچھ وظائف زیرِ لب پڑھتے ہوئے انگلی پہ پھونک کر پوروں کو آنکھوں پہ پھیر لیا اور سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت مجھے اس کے چہرے پہ ایک الگ ہی روشنی دِکھی اور میں دل ہی دل میں پشیمان ہو گئی کہ وہ بات چیت میں مگن ہو کر بھی اذان کے لفظوں کو بغور سن رہی تھی اور میں خاموش ہو کر بھی اذان کے الفاظ سننا تو دور اس کی حرکات و سکنات پر اسے برا بھلا کہتی رہی۔ تبھی سامنے سے ایک معذور عورت صادقہ کے قریب پہنچ کر اس کی بلائیں لینے لگی اور دعا دیتے ہوئے کہنے لگی کہ بیٹی تم نے میرے بچوں کے عید کے کپڑے خریدنے کے لیے جو پیسے دیے اس میں سب کے اچھے اچھے کپڑے سِل گئے۔ سب بچے بہت خوش ہیں اور تمھیں شکریہ کہتے ہیں۔ جب سے ان کے ابا کا انتقال ہوا ہے تب سے میں اپنی معذوری کے سبب اپنے بچوں کو عید کی خوشیاں دینے سے محروم رہ گئی تھی لیکن پچھلے کچھ برسوں میں تم تو فرشتہ کی

طرح ہماری زندگی میں آئی ہو اور ہماری اور ہمارے بچوں کی عید تمھارے ہی دم سے خوشیوں والی گزرنے لگی ہے۔ صادقہ نے اس معذور عورت کا ہاتھ تھام کر کہا کہ نہیں خالہ یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ بچے سب خوش ہیں۔ میں ان دونوں کی گفتگو سننے میں اتنی محو ہو گئی اور اپنی عبادات اور اپنا وجود مجھے اتنا حقیر لگنے لگا کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب رمشا میرا ہاتھ چھڑا کر سڑک پار کر شاپ میں رکھی گڑیوں کو دیکھ کر مچلتی ہوئی دوڑ پڑی اور جوں ہی مجھے احساس ہوا ایک گاڑی تیز رفتاری سے آتی دکھائی دی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ احمر کو میں نے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے چیخ ماری اور تب ہی صادقہ بھی ادھر متوجہ ہوئی اور چوڑیوں کو پھینکتے ہوئے رمشا کو بچانے دوڑ گئی اور رمشا کو اس نے دھکا دیا اور خود

’اس کی چار سالہ بیٹی مسلسل روئے جا رہی تھی اور اپنی ماں کو اٹھانے کی ناکام کوششوں میں لگی تھی۔صادقہ کے بوڑھے ماں باپ بھی اپنی بیٹی کی جواں سالہ موت پہ گہرے صدمے میں تھے اور زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ان کی بیٹی نے بیٹا بن کر انھیں سنبھالا اور کسی چیز کی تکلیف ہونے نہیں دی اب ان کا پرسان حال کوئی نہیں رہا۔‘

گاڑی کے پہیے کے نیچے آ گئی۔ پل بھر میں ایک مجمع لگ گیا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی رمشا کو اور کبھی صادقہ کے خون آلود کپڑوں کو دیکھتی رہی۔ اِرد گرد موجود لوگوں نے رمشا کو اٹھایا تو میں سرعت سے دوڑتی ہوئی اسے اپنی گود میں لیے چومنے لگی اور صادقہ کی طرف نظر کی تو زخموں سے چُور اُس کا وجود بے جان نظر آیا۔ اس کی روح پرواز کر چکی تھی لیکن اس کے چہرے پہ اب بھی سکون اور اطمینان کی جھلک واضح تھی۔ میرا وجود تھر تھر کانپنے لگا۔ میری حالت غیر ہونے لگی اور میں نے کسی طرح اسد کو فون ملایا اور وہ بھاگتے ہوئے ہمیں لینے آئے۔ گھر پہنچ کر میں چیخ چیخ کر رونے لگی اور اپنا آپ مجھے حقیر اور کم ظرف لگا۔ اسد نے مجھے کسی طرح سنبھالا۔ مغرب کے بعد صادقہ کی تدفین تھی۔ میں پہلی بار اُس کے گھر گئی۔ ہر ایک زبان پہ اس کی تعریف، ہر ایک شخص اس کے احسانوں کا ذکر کرنے میں مشغول، ہر ایک آنکھ میں اس کے لیے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہاں پہنچ کر مجھے علم ہوا کہ صادقہ ایک مہلک مرض میں مبتلا تھی اسی وجہ سے ڈاکٹر نے اسے روزہ رکھنے سے منع کیا ہوا تھا۔ اس کی چار سالہ بیٹی مسلسل روئے جا رہی تھی اور اپنی ماں کو اٹھانے کی ناکام کوششوں میں لگی تھی۔ صادقہ کے بوڑھے ماں باپ بھی اپنی بیٹی کی جواں سالہ موت پہ گہرے صدمے میں تھے اور زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ان کی بیٹی نے بیٹا بن کر انھیں سنبھالا اور کسی چیز کی تکلیف ہونے نہیں دی اب ان کا پرسان حال کوئی نہیں رہا۔ تبھی میں جو اتنی دیر سے اپنے آنسوؤں پہ باندھ لگانے کی کوششوں میں مصروف تھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صادقہ کے مردہ جسم کے پاس جا کر اس کے پیروں کو پکڑ کر معافی مانگتے ہوئے کہا کہ تم بہت عظیم ہو صادقہ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمھارا ظاہر دیکھا اور تمھارے بارے میں ہمیشہ غلط رائے قائم کی، تمھارے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا لیکن پھر بھی تم مجھ سے ہمیشہ مسکرا کر ملتی رہی اور آج تمھاری وجہ سے میری دنیا اجڑنے سے بچ گئی۔ میں تمھارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ اب سے تمھاری ساری ذمہ داریاں میری اور تمھاری بچی اب میری بچی کی طرح رہے گی اور یہی میرا کفارہ ہوگا۔ میں نے اسلام اور اسلامی احکامات کو ظاہری چیزوں میں تلاش کرنا چاہا لیکن تم نے مجھے بتایا کہ یہ تو باطن میں پوشیدہ ہے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اللہ نے کیوں فرمایا ہے کہ عمل کا دارو مدار نیت پہ ہے۔ میں روزے، عبادات اور تقویٰ میں بظاہر تم سے خود کو بہتر سمجھتی رہی لیکن تمھاری قربانی اور دوسروں کے کام آنے کے جذبے نے مجھے احساس دلایا کہ میں تم سے ابھی بہت پیچھے ہوں۔ تم تک پہنچنے کے لیے مجھے کڑی ریاضت کرنی ہوگی۔

روتے روتے میری آنکھیں سوج گئیں اور صادقہ کو لے جانے کا وقت آ گیا۔ جنازہ اٹھنے کے ساتھ ہی ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا اور سب لوگوں کی زبان پہ ایک ہی بات تھی کہ کتنی مبارک رات میں صادقہ اپنے معبود سے ملی ہے اور میں نے بھی اپنے دل میں اس بات سے اتفاق کیا اور اس کی مغفرت اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام کے لیے ڈھیروں دعائیں میرے لب سے نکلنے لگیں۔

□□□

Talat Fatma
C/o. Zarreen & Shireen Stores
1,Topsia Road
(South) Kolkata-700046 (W.B)
Mob: 9903786723
talatfatma04@gmail.com

لذیذ پکوان

عربی شاہی ٹکڑے

اجزا: ڈبل روٹی سلائس آٹھ سے دس عدد
خوبانی دس عدد سوکھی
چھوٹی الائچی چار عدد
چینی آدھی پیالی
تیل حسب ضرورت
ایواپوریٹڈ دودھ ایک ٹن
کارن فلور دو چائے کے چمچ
بادام دس سے بارہ عدد
اورنج مارملیڈ دو کھانے کے چمچ
چاندی کے ورق گارنش کے لیے

بنانے کی ترکیب: پہلے ڈبل روٹی سلائس کے دو یا چار ٹکڑے کر لیں۔ اب سوکھی خوبانیوں میں سے بادام نکال کر توڑ لیں۔ خوبانیوں کو باریک کاٹ لیں اور بادام چھلکے سمیت باریک کاٹیں۔ پھر چھوٹی الائچی کو چینی کے ساتھ پیس لیں۔ اس کے بعد کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں دو دو کر کے تمام ڈبل روٹی کے سلائس تل لیں۔

گولڈن ہونے پر نکال کر اخبار پر پھیلا دیں، تاکہ چکنائی جذب ہو جائے۔

اب فرائنگ پین میں ایواپوریٹڈ دودھ، کارن فلور اور چھوٹی الائچی ڈال کر ہلکی آنچ پر گاڑھا پیسٹ بنا لیں۔

پھر الگ فرائنگ پین میں چینی کو پگھلا کر کیریمل بنائیں اور اس میں بادام اور خوبانی شامل کر دیں۔

جب وہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں اورنج مارملیڈ ڈال دیں۔

اس کے بعد تلے ہوئے توس پر پہلے دودھ والا پیسٹ لگا کر خوبانی اور بادام کا کیریمل لگائیں۔ آخر میں چاندی کے ورق لگا کر مزیدار عربی شاہی ٹکڑے سرو کریں۔

قلفی آئس کریم

اجزا: تازہ دودھ ایک لیٹر
ایوپوریٹڈ ملک ایک پیالی
کنڈینسڈ ملک ایک پیالی، کریم (پھینٹی ہوئی) ایک پیالی

چھوٹی الائچیاں چند عدد
کیوڑہ ایسنس چند قطرے
چینی 4 کھانے کے چمچے
بادام (چوپ کیے ہوئے) 5 کھانے کے چمچے

بنانے کی ترکیب: دیگچی میں دودھ، الائچی اور چینی ڈال کر آدھا رہ جانے تک پکائیں۔ اس میں کیوڑہ ملا کر چولہا بند کر دیں۔ ایک پیالے میں ایواپوریٹڈ ملک کو الیکٹرک بیٹر سے دگنا ہونے تک پھینٹیں۔ پھر کنڈینسڈ ملک، کریم اور دودھ یکجان کر لیں۔ اس میں بادام ملائیں اور ڈیپ فریزر میں رکھ دیں۔

مینگو ڈیزرٹ

اجزا:
دودھ ایک کپ
آم چار عدد
کنڈینسڈ ملک ایک ٹن
ونیلا آئس کریم آدھا لیٹر، بسکٹ دو رولز
کریم ایک پیکٹ
یلو فوڈ کلر ایک چٹکی
مینگو ایسنس چند قطرے
جیلیٹن پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ
چیری اور پودینہ گارنش کے لیے

بنانے کی ترکیب: ایک ٹن کنڈینسڈ ملک، چند قطرے مینگو ایسنس، آم کا گودا، جیلیٹن اور آدھا لیٹر ونیلا آئس کریم کو مکس کر لیں۔ ایک گلاس میں دو رولر سٹک توڑ کر ڈالیں۔ پھر تیار مکسچر ڈال دیں۔ اوپر ایک پیکٹ کریم

اور ایک کپ دودھ ڈالیں۔ اس کے بعد آم، چیری اور پودینہ سے گارنش کر لیں۔ ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔

قوامی سویاں

اجزا: سویاں 1 کلو
شکر 1 کلو
دودھ ایک کلو
گھی ایک کپ
پسی ہوئی الائچی تین عدد
زعفران چائے کا چمچ (لازمی نہیں)

بنانے کی ترکیب: دودھ کو تیز گرم کر لیں۔ گھی میں الائچی کو بگھار دیں۔ سویاں اس میں ڈالیں، سنہری ہونے لگیں تو دودھ ڈال دیں۔ چینی کو آدھا کپ دودھ یا پانی میں پکا کر حل کر لیں اور ساتھ ہی چینی بھی ڈال دیں۔ اگر بادام پستہ ناریل ڈالنا ہو تو ساتھ ہی چینی بھی ڈال دیں۔

(بحوالہ: میٹھا دستر خوان، آذین غوث، سن اشاعت 2019)

ڈاکٹر محمد افروز عالم

عالمی یومِ ماحولیات اور انسانی صحت

عالمی یومِ ماحولیات 2022

عالمی یومِ ماحولیات 2022 کا تھیم ''صرف ایک زمین'' (Only one earth) فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مرکوز ہے۔ سال 2022 میں اسٹاک ہوم کنونشن کو 50 سال مکمل ہو رہے ہیں جس میں 5/جون کو عالمی یومِ ماحولیات کے طور پر نامزد کیا گیا تھا۔ سویڈن کی حکومت، اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام (UNEP) کے ساتھ شراکت میں عالمی یومِ ماحولیات 2022 کی سرگرمیوں پر مبنی پروگراموں کی میزبانی کر رہا ہے۔ عالمی یومِ ماحولیات 2022 کا انعقاد ''صرف ایک زمین'' کے تھیم کے تحت ہو رہا ہے جو کہ ایک صاف ستھری اور سرسبز طرز زندگی کے لیے ہماری پالیسیوں میں تبدیلی کے ذریعے فطرت کے ساتھ ہم آہنگی میں رہنے کی ضرورت کو اجاگر کرتا ہے۔ واضح رہے کہ 1972 کی اسٹاک ہوم کانفرنس کا نعرہ یا تھیم بھی ''صرف ایک زمین'' (Only one earth) تھا۔ پچاس سال بعد یہ نعرہ پھر سے بلند کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ سیارہ ہمارا واحد گھر ہے جس کے محدود وسائل کا صحیح استعمال اور تحفظ انسانی فریضہ ہے۔

ماحولیات اور آب و ہوا کے وزیر اور سویڈن کے نائب وزیر اعظم پیر بولونڈ نے کہا ہے کہ ''2022 کے عالمی یومِ ماحولیات کے قابل فخر میزبان کے طور پر، سویڈن سب سے زیادہ اہم ماحولیاتی خدشات، ہمارے ملک کے اقدامات اور آب و ہوا اور فطرت کے بحران سے نمٹنے کی کوششوں کو اجاگر کرے گا۔ ہم دنیا بھر سے عالمی برادری کو اہم مباحثوں اور تقریبات میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں''۔

2022 میں جاری کی گئی اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام (UNEP) کی ''Making peace with nature'' رپورٹ کے مطابق، سماجی اور اقتصادی نظام کو تبدیل کرنے کا مطلب فطرت کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانا، اس کی قدر کو سمجھنا اور اس قدر کو فیصلہ سازی کے مرکز میں رکھنا ہے۔ 2022 میں ہم امید کرتے ہیں کہ دنیا کو Covid-19 وبائی مرض کے بدترین دور سے گزرنے کے بعد کچھ مثبت ماحولیاتی

اقدامات اٹھاسکیں۔

پانچ دہائیاں قبل اسٹاک ہوم کانفرنس کی میزبانی کے بعد سے سویڈن نے ماحولیاتی تحفظ کے لیے بامعنی پیش قدمی کی ہے اور ریکارڈ سرمایہ کاری بھی، جس میں 2045 تک خالص صفر اخراج اور اس کے بعد منفی اخراج کو حاصل کرنے کا طویل مدتی آب وہوا کا ہدف شامل ہے۔ 2022 میں ماحولیات کا عالمی دن ایک تاریخی عزم، قیادت اور مستقبل کے لیے اعلیٰ سطح کی خواہش دونوں کی عکاسی ہے۔ کووڈ وبا کے بعد پائیدار ماحولیاتی بحالی کے حصول کے لیے عمل درآمد کو تیز کیا جائے گا۔ UNEP کی قیادت میں 150 سے زائد ممالک شرکت کررہے ہیں۔ دنیا بھر کی بڑی کارپوریشنز، این جی اوز، کمیونیٹیز، حکومتوں اور مشہور شخصیات نے ماحولیاتی بیداری کو آگے بڑھانے کے لیے عالمی یومِ ماحولیات برانڈ کو اپنایا ہے۔

UNEP ماحولیات کے موضوع پر عالمی سطح پر آواز اٹھانے والی سرکردہ تنظیم ہے۔ یہ قیادت فراہم کرتا ہے اور مستقبل کی نسلوں سے سمجھوتہ کیے بغیر قوموں اور لوگوں کو ان کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے حوصلہ افزائی، آگاہی اور اہل بنا کر ماحولیات کی دیکھ بھال میں شرکت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لہٰذا عالمی یومِ ماحولیات 2022 ماضی پر غور کرنے اور مستقبل کا بہتر تصور کرنے کا دن ہے۔ امید ہے کہ 2022 تک کی سرگرمیاں اہم پیش رفت کے ساتھ ساتھ آنے والی دہائیوں میں آگے کی چیزوں پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔

عالمی ماحولیاتی مسائل اور انسانی صحت پر اثرات

اصطلاح ماحولیات سے مراد وہ قدرتی ماحول ہے جس میں ہم رہتے ہیں یہ حیاتیاتی یعنی جاندار بشمول پودے، جانور، پرندے وغیرہ او رغیر حیاتیاتی اجزاء یعنی زمین، ہوا، پانی وغیرہ کے درمیان تعامل ہیں جو اس قدرتی ترتیب کو تشکیل دینے کے لیے ایک ساتھ موجود ہیں۔ ماحولیات کے چار بڑے اور اہم کام ہیں۔

1. وسائل کی فراہمی
2. زندگی کی بقاء
3. جمالیاتی قدر فراہم کرنا
4. پیداوار اور استعمال کے مختلف سرگرمیوں سے پیدا ہونے والے فضلے کا انضمام۔

معاشی ترقی کا حصول کسی بھی ملک کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ لیکن کیا یہ قابل قدر ہے کہ یہ ماحولیاتی انحطاط کی قیمت پر ہو؟ وہ فائدے جو ماحولیاتی انحطاط کے برے اور مضر اثرات سے حاصل ہوں، کیا قابل قبول ہیں؟

یوں تو عالمی ماحولیاتی مسائل بے شمار ہیں لیکن کچھ ایسے مسائل ہیں جس نے ہر ملک کو ان پر قابو پانے کے لیے عملی اقدامات اٹھانے کے لیے مجبور کیا ہے تاکہ آئندہ نسلوں کو صاف ستھرا ماحول دستیاب رہے۔ کچھ ایسے ماحولیاتی مسائل ہیں۔

1. اوزون کی تہہ میں کمی
2. گرین ہاؤس ایفکٹ
3. تیزابی بارش
4. زمین کو صحرا میں تبدیل کرنا
5. ماحولیاتی آلودگی

1. اوزون کی تہہ میں کمی (Ozone Layer Depletion)

اوزون (O3) فضا کی وہ تہہ ہے جو زمین سے اوپر 10 سے 45 کیلو میٹر تک پھیلی ہوئی ہے اور الٹراوائلیٹ ریز (UV Rays) کو زمین تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ خالص حالت میں اوزون (O3) ہلکی نیلی دھماکہ خیز اور زہریلی گیس ہے، جسے زمین کا حفاظتی غلاف بھی کہتے ہیں۔ اوزون کے مالی کیولز سورج کی الٹراوائلیٹ ریز کو زمین پر آنے سے روکتے ہیں۔ فضاء کا 99 فیصد حصہ اسٹریٹو اسیفر یا اوزون تہہ کے نیچے آتا ہے۔ سال 1985 میں انگلینڈ میں سائنسدانوں نے تحقیقی معلومات پیش کیں کہ موسم بہار میں انٹارک ٹیکا کے اوپر اوزون کی تہہ میں 40 فیصد تک کمی واقع ہوئی ہے، اور زمین کے اس حفاظتی غلاف میں ایک سوراخ نظر آ رہا ہے۔ اگرچہ اوزون کی تہہ میں سوراخ انٹارک ٹیکا کے اوپر بہت زیادہ ہے، لیکن پوری دنیا میں بھی اوزون کی تہہ کی موٹائی میں کمی خصوصاً امریکہ اور برصغیر پر اثر انداز ہوگی۔ اوزون کی تہہ کی موٹائی میں کمی کی اہم ترین وجہ کلورو فلورو کاربن (CFC) ہیں، جن میں کلورین، فلورین اور کاربن موجود ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ استعمال ایئر کنڈیشنز اور ریفریجریٹر میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ انھیں پلاسٹک فوم انڈسٹری اور ایروسول اسپرے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان گیسوں سے بجلی کی اشیا کے مختلف حصے بھی صاف کیے جاتے ہیں۔ یہ کیمیکلز بہت ہی قائم رہنے والے (Stable) اور محفوظ تصور کیے جاتے ہیں، مگر ان کی سالمیت ہی سب سے بڑا مسئلہ ثابت ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ کیمیائی طور پر تبدیل نہیں ہوتے ہیں اور جیسے جیسے یہ فضا میں بلند ہوتے ہیں اور اسٹریٹوسفیئر میں پہنچتے ہیں، وہاں سورج کی الٹراوائلیٹ ریز سے ٹوٹتے ہیں اور کلورین ایٹم میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کلورین ایٹم اوزون (O3) کے مالیکولز کو آکسیجن میں تبدیل کرتا ہے جب کہ خود ویسے ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد کلورین ایٹم اوزون مالیکولز کے ساتھ ملتا ہے اور اس کو پھر آکسیجن میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اس عمل میں دوبارہ اوزون کا مالیکول نہیں بنتا ہے۔ ایک اکیلا کلورین ایٹم اوزون کے ایک لاکھ مالیکولز کے ساتھ مل کر اسے آکسیجن میں توڑتا ہے۔ اگر کلورو فلورو کاربن کی مقدار کو کنٹرول نہ کیا گیا تو آئندہ سالوں میں اوزون کی تہہ کی موٹائی میں مزید کمی واقع ہو سکتی ہے۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ 60 فیصد تک کمی واقع ہو جائے گی۔

پوری دنیا کے لیے یہ فکری لمحہ ہے کیونکہ اوزون کی تہہ میں کمی سے مختلف قسم کی بیماری پیدا ہو رہی ہیں، مثلاً جلدی امراض، جلد کا کینسر، جلد الرجی، آنکھوں کی الرجی، آنکھوں میں پانی، سانس کی تکلیف، دمہ، کھانسی، جلد بڑھاپا آنا وغیرہ۔

2. گرین ہاؤس ایفکٹ (Green House Effect)

گرین ہاؤس ایفکٹ کو سمجھنے کے لیے یہاں پر ایک مثال پیش ہے۔گرین ہاؤس دراصل شیشے کی دیواروں اور شیشے کی ہی چھت والا ایک بڑا ہال ہوتا ہے۔جس میں ضرورت کے مطابق اپنی مرضی سے درجہ حرارت رکھ سکتے ہیں اور پودوں کو ان کی ضرورت کے مطابق کم یا زیادہ حرارت میں اگایا جاتا ہے۔اس عمل میں سورج کی روشنی گرین ہاؤس کے شیشے کے اندر داخل ہوتی ہے اور اس کے اندر موجود مٹی اور پودے اسے جذب کرتے ہیں اور باقی ماندہ روشنی لمبی ویولینتھ والی انفراریڈ شعاعوں کی شکل میں واپس فضا میں چلی جاتی ہے لیکن شیشے کے اندر آکر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ شیشے کی ایک خاص خصوصیت ہے کہ وہ روشنی کی شعاعوں کو جذب تو کر لیتا ہے مگر واپس جانے نہیں دیتا۔یہی وجہ ہے کہ یہ روشنی بھی شیشے کے اندر ہی رہتی ہے اور اسی کی وجہ سے گرین ہاؤس کے اندر درجہ حرارت باہر کی بہ نسبت بڑھ جاتا ہے۔

مندرجہ بالا مثال کی روشنی میں فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO2) کی مقدار روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ کیونکہ دور جدید میں زیادہ سے زیادہ ایندھن استعمال کیا جارہا ہے۔ ایندھنوں کے جلنے سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے مقدار میں کافی اضافہ ہوا ہے جس کے نتیجے میں زیادہ CO2 فضا میں جمع ہوتی جارہی ہے اور بالکل ویسے ہی کام کر رہی ہے جیسے شیشے کی دیواریں گرین ہاؤس میں کرتی ہیں۔یعنی گرین ہاؤس میں شیشے کی دیواریں شعاعوں کو جذب تو کر لیتی ہیں مگر واپس نہیں جانے دیتی ہے اور اس طرح گرین ہاؤس کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔اسی طرح فضا میں CO2 گیس کی بڑھتی ہوئی مقدار سورج کی شعاعوں کو زمین سے ٹکرا کر فضا میں جانے سے روک رہی ہے۔جس کے نتیجے میں زمین کا درجہ حرارت بڑھتا چلا جاتا ہے۔اسی حرارت کے بڑھنے کی وجہ کو گرین ہاؤس ایفکٹ کہتے ہیں۔

گرین ہاؤس ایفکٹ کے کافی مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں،مثلاً:

☆ مان سون کے خطے تبدیل ہو رہے ہیں۔

☆ آئس کیپس (Ice Caps) پگھل کر میدانوں میں آجانے کا خطرہ لاحق ہے۔

☆ گلیشئر پگھلیں گے جس سے دریاؤں میں پانی بڑھ جائے گا اور سیلاب آئے گا۔

☆ سیلابوں کی وجہ سے سطح سمندر بھی بلند ہو جائے گی جس سے بہت سے ساحلی علاقے ڈوب جائیں گے۔

☆ ان سیلابوں کی وجہ سے بہت سے جانوروں اور پرندوں کی چراگاہیں اور مساکن ختم ہونے کا خطرہ ہے۔جب کہ خوراک نہ ملنے کی وجہ سے بہت سی انواع کی آبادی ختم ہونے کا بھی خطرہ ہے جو غذائی زنجیر (Food Chain) میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

3. تیزابی بارش (Acid Rain)

موٹر گاڑیوں، کار، فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں میں نائٹروجن اور سلفر ڈائی آکسائیڈ ہوتے ہیں جو فضا میں آبی بخارات کے ساتھ مل کر نائٹرک ایسڈ اور سلفیورک ایسڈ بناتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو یہی تیزاب (Acid) کی شکل میں بارش کے ساتھ زمین پر آجاتے ہیں۔ایسی بارش تیزابی بارش کہلاتی ہے۔

تیزابی بارش کے نقصانات کافی ہیں،مثلاً:

☆ درختوں اور جنگلات کو ختم کرنے کا سبب بنتی ہے۔

☆ زرخیز زمین کی زرخیزی کو تباہ کرتی ہے۔

☆ فصلوں کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔

☆ دریاؤں اور سمندروں میں آبی مخلوقات کی موت کا باعث بنتی ہے۔

☆ عمارتوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔

4. زمین کو صحرا میں تبدیل کرنا (Desertification):

انسانی سرگرمیاں، جانوروں کی سرگرمیاں، جنگلات اور درختوں کا کٹنا، زمین میں بار بار ایک قسم کی فصل اگانا مجموعی طور پر زمین کو بے جان بناتی ہے۔جس سے اس کی زرخیزی باقی نہیں رہتی اور وہ ناقابل استعمال ہو جاتی ہے۔ اس سارے عمل کو ہی Desertification کہا جاتا ہے۔ مسلسل فیکٹریوں میں اضافہ، چوڑی اور لمبی سڑکوں، ہائی وے اور گھروں کی تعمیرات کے باعث جنگلات کی کمی واقع ہو رہی ہے۔

5. ماحولیاتی آلودگی (Environmental Pollution):

ماحولیاتی آلودگی کے اقسام میں زمینی آلودگی، آبی آلودگی، ہوائی آلودگی، شعاعی آلودگی، شور آلودگی وغیرہ ہیں۔آلودگی خواہ کسی بھی قسم کی ہو اس سے انسانی صحت اور قدرتی ماحول بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ماحول میں ہونے والی منفی تبدیلیوں کی روک تھام کے لیے شجر کاری کی جائے۔سائکلنگ اشیا کا استعمال کیا جائے تا کہ کچرا بننے کے امکانات کم سے کم ہوں۔ بے تحاشہ استعمال میں آنے والی کیمیائی اشیاء، دوائیں، کیڑے مارنے کی ادویہ، پلاسٹک پیکنگ اور آرائشی سامان وغیرہ بھی ایسی چیزیں ہیں جن سے آلودگی پیدا ہو رہی ہے اور انسانی صحت پر منفی

اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ عالمی سطح پر ماحولیاتی آلودگی کی بگڑی ہوئی صورت حال ایک چیلنج سے کم نہیں ہے۔ اگر ہم ماحولیات کے حوالے سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے گھروں کا ماحول بھی رہنے کے لیے سازگار نہیں ہے۔ اکثر گھروں میں مناسب روشنی، ہوا اور حرارت کا فقدان ہے۔ گاؤں، شہر، محلوں، اور گلیوں میں جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ پلاسٹک کی پولی تھین کے لفافے ہر طرف اڑتے نظر آتے ہیں، جو کہ پانی کی نکاسی کے نظام کے لیے مسلسل خطرہ ہیں۔ کچرے کے ڈھیروں کو آگ لگانا تو روز مرّہ کا معمول بن گیا ہے۔ جس سے طبعی اور حیاتیاتی ماحول متاثر ہو رہا ہے۔ شہروں میں صنعتی اداروں سے خارج ہونے والے گندے پانی کو ندی، نالوں، دریاؤں، جھیلوں او رسمندروں میں بہا دیا جاتا ہے، جس نے دریاؤں اور جھیلوں کے پانی کو بھی آلودہ کر دیا ہے۔ چمنیوں سے نکلی ہوئی زہریلی گیسوں نے فضاء کو بھی آلودہ کیا ہے۔ کھیتی باڑی میں زرعی ادویات کا غلط استعمال انسانی صحت پر منفی اثرات ڈال رہے ہیں۔ لہٰذا ماحولیاتی آلودگی وہ منفی عمل ہے جس سے زمینی، آبی او رفضائی وسائل خراب ہوتے ہیں۔ آلودگی کی وجہ سے انسان، حیوانات اور نباتات اپنی فطری روش برقرار نہیں رکھ سکتے اور ان کی صحت اور بقاء کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

تحفظ ماحولیات اور ہماری ذمہ داریاں

جس ماحول میں ہم رہتے ہیں اس کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے کیونکہ یہ نہ صرف ہمیں صحت مند رکھتا ہے بلکہ یہ ہماری آنے والی نسل کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ کے مطابق، ہندوستان ہر سال 33 لاکھ میٹرک ٹن پلاسٹک پیدا کرتا ہے۔ اسے کنٹرول کرنا ہر ہندوستانی کی ذمہ داری ہے۔ حکومت ملک میں آلودگی پر قابو پانے کے لیے بھی بہت سی کوششیں کر رہی ہے۔ اسی طرح کئی نجی کمپنیاں بھی کچرے کو ری سائیکل کر کے استعمال کر رہی ہیں۔ ہندوستان میں ماحولیاتی تحفظ کا ایکٹ ہماری ذمہ داری کا تعین کرتا ہے۔ ماحولیات کے تحفظ اور معیار کو یقینی بنانے کے لیے 1986 میں ''انوائرمنٹ پروٹیکشن ایکٹ'' نافذ کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کے تحت وقتاً فوقتاً چند اہم نکات کو شامل کیا جاتا رہا ہے۔ کچھ اہم نکتے حسب ذیل ہیں:

1. ماحول کے معیار کی حفاظت کے لیے تمام ضروری اقدامات کرنا۔
2. ماحولیاتی آلودگی کی روک تھام، کنٹرول اور تخفیف کے لیے ملک گیر پروگرام کی منصوبہ بندی اور نفاذ کرنا۔
3. ماحولیاتی معیار کا تعین کرنا۔
4. ماحولیاتی تحفظ سے متعلق ایکٹ کے تحت ریاستی حکومتوں، افسران اور متعلقہ افراد کے کام کو مربوط کرنا۔
5. ایسے علاقوں کی حد بندی جہاں نہ کوئی صنعت قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی صنعتی سرگرمیاں چلائی جا سکتی ہیں وغیرہ۔

مذکورہ ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سخت سزا کا بھی انتظام ہے۔

ہم لوگ جو بھی اشیاء غذا کے طور پر کھاتے ہیں، جو پانی ہم لوگ پیتے ہیں، جس ہوا میں ہم سب سانس لیتے ہیں اور جو ماحول ہماری زمین کو رہنے کے لیے سازگار بناتا ہے، وہ سب ہمیں فطرت سے ملتا ہے۔ کائنات کو چلانے میں ماحولیات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا جب ہمیں ماحول سے بہت سی چیزیں مل رہی ہیں تو اس کی حفاظت کو یقینی بنانا ہماری ذمہ داری ہے۔ پچھلے دو سال کے دوران کورونا وائرس کی وبا نے انسان کو اپنے گھروں میں محصور کیا۔ جب کہ انجانے میں اس وبا نے ہمیں سکھایا ہے کہ ماحول کی حفاظت کیسے کرنی چاہیے۔ اگر ہم لوگ زمین کو دوبارہ جنت بنانا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل پانچ اہم قراردادیں اپنا لیں اور عمل کریں:

1. پہلی قرارداد: دور جدید میں ہر طرف صنعتوں کے کارخانے کھل گئے ہیں جس کی وجہ سے بہت سا فضلہ باہر نکلنا شروع ہو گیا ہے۔ ان فیکٹریوں کا فضلہ کھلے یا دریاؤں میں پھینکا جاتا ہے۔ عام لوگ بھی اس چیز کو نقل کرنے لگے ہیں اور جگہ جگہ کچرا پھینکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے آلودگی بڑھ رہی ہے۔ اس یوم ماحولیات کے موقع پر ہم لوگ عہد کریں کہ اپنی جگہ سے نکلنے والے کچرے اور فضلہ کو صحیح اور مناسب جگہ تک پہنچائیں۔
2. دوسری قرارداد: آج کل لوگ ترقیاتی کاموں کی آڑ میں درخت اور پودے اندھا دھند کاٹ رہے ہیں۔ ہمیں اس چیز کو چھوڑ دینا چاہیے۔ درختوں کی کٹائی سے نہ صرف ہم آکسیجن سے محروم ہو سکتے ہیں بلکہ موسم کا پورا چکر درہم برہم ہو سکتا ہے جس کے بعد ہمیں خوفناک قدرتی آفات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ہم سب عہد کریں کہ درخت نہ کاٹیں گے اور نہ کاٹنے دیں گے۔ مزید پودے لگائیں گے۔
3. تیسری قرارداد: سانس لینے کے لیے ہوا کو صاف رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے جو کچھ ہو سکے کریں تا کہ ہم سبھی صاف کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے استعمال پر توجہ دی جائے اور متبادل ایندھن گیس اور ای گاڑی کے استعمال

میں اضافہ ہوا۔

4. چوتھی قرارداد: درختوں، پودوں، زمین، سورج، جانوروں اور دیگر مخلوقات کی وجہ سے ماحول میں توازن برقرار رہے۔ ہم سب اسے سمجھیں اور دوسرے ساتھیوں کو بھی سمجھائیں۔

5. پانچویں قرارداد: آج کے دور میں ماحول کا سب سے بڑا دشمن اگر کوئی ہے تو وہ پولی تھین یا پلاسٹک ہے۔ آج سے ہی اس کا استعمال بالکل بند کردیں۔ اگر ہمارے سامنے کوئی اور بھی پولی تھین استعمال کر رہا ہے تو اسے بھی انکار کردیں اور منع کریں، تاکہ ماحول کو پلاسٹک فری کیا جاسکے۔

تحفظ ماحول میں معاشرے کا کردار:

ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانا تو بہت ہی مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ کیونکہ اس کے لیے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ معاشرے میں انسان انفرادی طور پر اگر یہ ارادہ کرلیں کہ خود کو اور اپنے ماحول کو صاف رکھیں گے تو ماحولیاتی آلودگی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس کو ختم کرنا انتہائی دشوار ہے کیونکہ قدرتی ماحول کو اس قدر خراب کیا جاچکا ہے کہ اب اوزون کی تہہ کی موٹائی میں کمی جیسے مسائل درپیش ہیں۔

صحت و صفائی ستھرائی کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔ اگر گاؤں، محلوں، شہروں کو صاف نہ کیا جائے تو انسانی صحت کو نقصان لاحق ہوتا ہے۔ لہٰذا صفائی ستھرائی اچھی صحت کی ضمانت ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ صفائی ستھرائی اور صحت کا خیال رکھیں۔ ہر فرد اپنی ذاتی رہائش گاہ اور کام کی جگہ کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھے۔

ماحولیات کے تحفظ میں معاشرے کا کردار کچھ اس طرح معنی خیز ہوسکتا ہے:

1. درخت اور پودے لگائیں۔
2. گندگی پر قابو پانے کے لیے ذاتی اقدامات اٹھائیں۔
3. سیوریج کو کھلا نہ چھوڑیں۔
4. گھریلو کوڑا کرکٹ کو مناسب جگہ پر رکھیں۔
5. زرعی کیمیاء کا مناسب استعمال کریں۔
6. قدرتی توانائی کے ذرائع کا موثر استعمال کریں۔
7. ٹریفک کے دھوئیں کو کنٹرول کرنے کے لیے اقدامات اٹھائیں۔
8. صنعتی فضلات مواد کو کنٹرول کریں۔
9. بنیادی ماحولیاتی تعلیم کو عام کریں۔
10. نامیاتی زراعت (Organic Agriculture) اور کاشت کاری (Cultivation) کو اپنائیں۔

ماحولیات میں حیاتیاتی تنوع کا تحفظ، پائیدار ترقی کا ضامن:

حیاتیاتی تنوع کے تحفظ سے مراد حیاتیاتی وسائل کا انتظام ہے تاکہ ان کے وسیع پیمانے پر استعمال کے ساتھ ساتھ ان کا معیار بھی برقرار رہے۔ چوں کہ حیاتیاتی تنوع انسانی تہذیب کی ترقی کا ستون ہے، اس لیے اس کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ حیاتیاتی تنوع ہماری لباس، خوراک، ادویات، ایندھن وغیرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی تحفظ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ حیاتیاتی تنوع ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ قدرتی آفات جیسے سیلاب، خشک سالی وغیرہ سے بھی راحت فراہم کرتا ہے۔ درحقیقت، حیاتیاتی تنوع فطرت کی ایک قدرتی ملکیت ہے اور اس کا نقصان ایک طرح سے فطرت کا نقصان ہے۔ اس لیے فطرت کو تباہ ہونے سے بچانے کے لیے حیاتیاتی تنوع کا تحفظ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

عالمی تحفظ کی حکمت عملی نے حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کی ہیں۔

1. ان انواع کے تحفظ کے لیے کوششیں کی جائیں جو خطرے سے دو چار ہیں۔
2. معدومیت کو روکنے کے لیے مناسب منصوبہ بندی اور انتظام کی ضرورت۔
3. خوراکی فصلوں، چارے کے پودوں، مویشیوں، جانوروں او رجنگلی پودوں کی حفاظت کی جائے۔
4. ہر ملک کی جنگلی انواع کے مسکن کی نشاندہی کرنا اور ان کے تحفظ کو یقینی بنانا۔
5. انواع کے رہائش گاہوں کو تحفظ فراہم کرنا تاکہ پرجاتیوں کو خوراک، افزائش نسل اور بچوں کی پرورش ہوسکے۔
6. جنگلی پودوں اور جانوروں کی بین الاقوامی تجارت کو کنٹرول کرنا۔

لہٰذا نباتات اور حیوانات کی انواع اور ان کے مسکن کو بچانے کے لیے ایک وقتی پروگرام کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کو فروغ دیا جاسکے۔ لہٰذا، تحفظ کا ایکشن پلان لازمی طور پر درجہ ذیل سمت میں ہونا چاہیے:

1. ملک کے مختلف علاقوں بشمول جزائر میں پائے جانے والے حیاتیاتی وسائل کی فہرست بنانا
2. محفوظ علاقے جیسے نیشنل پارک، بایوسفیئر ریزرو، سینکوری، جین فنڈ

وغیرہ کے نیٹ ورک کے ذریعے حیاتیاتی تنوع کا تحفظ۔

3. انحطاط شدہ رہائش گاہ کو اس کی قدرتی حالت میں دوبارہ تخلیق کرنا۔
4. پرجاتیوں کو انسانی دباؤ سے کسی اور جگہ اگانے سے بچانا۔
5. محفوظ علاقے کی تشکیل سے بے گھر ہونے والے قبائلیوں کی بحالی۔
6. بائیوٹیکنالوجی اور ٹشو کلچر کی جدید تکنیک کے ذریعے خطرے سے دوچار انواع کی ضرب۔
7. مقامی جینیاتی تنوع کے تحفظ کے لیے گھریلو پودوں اور جانوروں کی انواع کا تحفظ۔
8. خطرے سے دوچار پرجاتیوں کا دوبارہ ہونا۔
9. تفصیلی جانچ کے بغیر غیر ملکی نسل کے پودوں کے داخلے پر پابندی ۔
10. وسیع رقبہ پر ایک ہی قسم کے پودے لگانے کی حوصلہ شکنی۔
11. مناسب قانون سازی کے ذریعے پرجاتیوں کے استحصال پر کنٹرول۔
12. پرجاتیوں کے تجارتی معاہدے کے تحت استحصال پر کنٹرول۔
13. جینیاتی وسائل کا پائیدار استعمال اور مناسب قانون سازی کے ذریعے تحفظ۔
14. تحفظ میں مددگار روایتی علم اور ہنر کا فروغ۔

کرہ ارض ہمارا مشترکہ گھر ہے۔ انسانیت اور فطرت کے درمیان ہم آہنگی کے لیے دنیا کے تمام ممالک کو مل کر کام کرنا چاہیے اور ایک خوبصورت کرہ ارض کی تعمیر کے لیے تیزی سے کام کرنا چاہیے۔ انسانیت کے مشترکہ مستقبل کی خاطر ہمیں اعلیٰ معیار کی انسانی ترقی کا ایک نیا سفر شروع کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں انسانیت اور فطرت کے مابین ہم آہنگ تہذیب کی تعمیر کی جائے۔ عالمی پائیدار ترقی میں مدد کے لیے ماحول دوست تبدیلی لائی جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حالیہ کووڈ-19 (کورونا وائرس) کی وبائی صورت حال نے دنیا کی ترقی پر منفی اثر ڈالا ہے۔ اقوام متحدہ کے 2030 کے پائیدار ترقیاتی ایجنڈے کو فروغ دینے کے لیے دنیا کو متعدد چیلنجز کا سامنا ہے ۔ جن میں دو اہم ترین امور معیشت کی بحالی اور ماحولیاتی و حیاتیاتی تنوع کا تحفظ ہے۔ کیونکہ کرہ ارض کی ساری رونقیں حیاتیاتی تنوع کے دم سے ہی ہیں اور اسی نے انسانیت کی ترقی کی بنیاد بھی فراہم کی ہے۔

حیاتیاتی تنوع کا تحفظ کرہ ارض کے تحفظ میں مددگار ہے اور نبی نوع انسان کی پائیدار ترقی کا ضامن ہے۔ حیاتیاتی تہذیب انسانی تہذیب کی ترقی کا تاریخی رجحان ہے۔ فطرت کے وسیع ثمرات سے اسی صورت میں مزید فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جب انسان اس کا تحفظ کرے گا۔

لہٰذا پائیدار ترقی کے لیے لازمی ہے کہ گھٹتی ہوئی حیاتیاتی تنوع او ربڑھتے ہوئی ماحولیاتی انحطاط پر قابو پایا جائے۔ ماحولیاتی انحطاط کی روک تھام صرف حکومت اور اداروں کا کام ہی نہیں بلکہ اس میں ہر فرد کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ لہٰذا عالمی برادری میں حیاتیاتی تنوع کی حفاظت اور ماحولیاتی انحطاط کے تئیں شعور و آگہی کو بیدار کرنے کے لیے امسال ماحولیات کا عالمی دن کافی اہم ہے۔

حوالے:

1. اقوام متحدہ ماحولیاتی پروگرام (UNEP)، https://www.unep.org
2. اقوام متحدہ فنڈ برائے آبادی (UNFPA)، https://www.unfpa.org
3. امیر احمد، ماحولیات، بنگلور، 1997
4. اے بی سکسینا، ماحولیاتی تعلیم، آگرہ، 1986
5. کیتھرین جوزف، ماحولیاتی تعلیم، حیدرآباد، 2011
6. محمد افروز عالم، مضامین تعلیم وتدریس، نئی دہلی، 2019
7. محمد شمش الحق، ماحولیات، نئی دہلی، 1998
8. محمد نسیم اختر، جہان سائنس، دہلی، 2012
9. نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT)، http://www.ncert.nic.in
10. قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL)، https://www.urducouncil.nic.in
11. عالمی ادارہ صحت (WHO)، https://www.who.int

Dr. Md. Afroz Alam

Assistant Professor

Maulana Azad National Urdu University

College of Teacher Education

Chandanpatti, Laheria Sarai

Darbhanga 846002 (Bihar)

Mobile: +91-8885472844

Email:afrozmanuu@gmail.com

حسن کی نگہداشت

ابٹن

ابٹن کے چنددن مسلسل استعمال سے چہرے کی جلد کوخوبصورت اورنکھرانکھرابنایا جاسکتا ہے،طبی ماہرین کے مطابق چہرے کی جلد کی سطح کے نیچے لاکھوں خلیوں کی نئی پرت بنتی رہتی ہے اور پرانے مردہ خلیے جھڑتے رہتے ہیں۔مردہ خلیے جھڑنے میں تین ہفتوں کا وقت لگتا ہے،مردہ خلیوں کی پرت اگروقت پرجلد سے الگ نہ ہو پائے،تو یہ جلد پر جم جاتی ہے،ایسے میں جلد بے جان اور دھندلی دکھائی دینے لگتی ہے، رنگ بھی پھیکا پڑنے لگتا ہے اس کے علاوہ جلد کی نمی اور چکنا بنائے رکھنے کی طاقت بھی کم ہو جاتی ہے، نمی اور چکنائی کے فقدان سے جلد پر جھریاں ابھر آتی ہیں،جب خلیوں کو پھیلنے کی جگہ نہیں ملتی تو یہ مردہ خلیوں کے اردگرد جمع ہو کر مہاسوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں،ایسے میں جلد کی باقاعدہ صفائی کے ساتھ ساتھ ابٹن کا استعمال کیا جائے تو جلد کی خوبصورتی اور چکنائی کومحفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ابٹن مردہ خلیوں کو دور کر کے جلد کوتندرست بناتا ہے،اس سے چہرے کی جلد صاف اور چمکدار نظر آتی ہے۔کیمیکل سے پاک ابٹن بازار میں دستیاب ہے۔ترکیب کے مطابق اسے پانی یا دودھ میں مکس کر کے آدھے گھنٹے تک چہرے پر لگا رہنے دیں اور پھر گیلی روئی سے صاف کر کے ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں،کیمیکل سے پاک ہونے کی وجہ سے یہ جلد کے لیے بالکل بے ضرر ہوتا ہے اس لیے اس روزانہ بھی استعمال کیا جاسکتا

ہے۔ اکثر بیوٹیشنز ابٹن خشک ہونے پر اسے چہرے پر رگڑنے کا مشورہ دیتی ہیں تاہم ایسا کرنے سے جلد پر دھبے نمودار ہو سکتے ہیں، ابٹن چہرے پر لگا رہنے دیں تو بھی یہ مکمل موثر ثابت ہوتا ہے۔

جلد کی شادابی کے لیے ماسک

ملازمت پیشہ خواتین کے لیے اپنے مصروف اوقات کار میں سے چہرے اور جلد کی حفاظت اور اپنے رنگ و روپ کو نکھارنا نہایت مشکل مرحلہ ہوتا ہے اس کے علاوہ بعض گھرانوں کا طرز رہائش کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ وہاں خواتین کا بیشتر وقت دھوپ میں گزرتا ہے، ایسی صورت حال میں جلد کی قدرتی تازگی کا خاتمہ اور رنگ کا جل جانا لازمی امر ہے۔

اس حوالے سے عام مشاہدہ یہی ہے کہ خواتین کی اکثریت دھوپ سے جلے رنگ کو نکھارنے کے لیے مختلف رنگ گورا کرنے کی کریمیں یا پھر بلیچ استعمال کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مقصد کے لیے تین سے چار کریموں کے مکسچر کا استعمال جلد کو وقتی طور پر تو صاف ستھرا کر دیتا ہے تاہم یہ مستقل طریقہ علاج نہیں۔ اس کے علاوہ اس طرح جلد کی قدرتی رنگ کی واپسی بھی ممکن نہیں تاہم ان کریموں کا استعمال جلد کے دیگر مسائل میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ دھوپ سے جلے رنگ کو نکھارنے کے لیے عرق گلاب اور پھٹکری کا استعمال نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے تھوڑی سی پھٹکری کو عرق گلاب میں پیس کر شامل کریں اب اس آمیزے کو رات میں سونے سے قبل آدھے گھنٹے کے لیے چہرے پر لگائیں۔

سانولے رنگ کو گورا کرنا

بعض خواتین اپنے سانولے رنگ کی وجہ سے کمپلیکس میں مبتلا ہو جاتی ہیں حالانکہ سانولے رنگ کی اہمیت اپنی جگہ ہے اور سانولا رنگ بھی کشش کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن خواتین یہ چاہتی ہیں کہ ان کی رنگت بھی گوری ہو اور باقی خواتین کی طرح وہ بھی خوبصورت و حسین لگیں تو اور وہ گھر پر ہی اپنے رنگ کو گورا کر سکتی ہیں اس کے لیے انھیں تھوڑی سی محنت کرنا ہوگی۔ مکئی اور جو کا آٹا ہم وزن لے کر اس میں آدھے لیموں کا رس ملا کر لئی سی بنا لیں اور اس لئی کو گردن اور چہرے پر ملیں، آدھے گھنٹے کے بعد نیم گرم پانی سے اسے صاف کر لیں یہ عمل ہفتے میں دو مرتبہ کریں۔ جب دھوپ میں نکلنے سے رنگت سیاہ ہو جائے اور دھبے پڑ جائیں تو انگور کو توڑ کر چہرے پر ملیں تھوڑی دیر بعد جلد خشک ہو جانے پر پانی سے دھو لیں۔ موسم سرما میں ادرک کو چھیل کاٹ کر چہرے پر ملنے سے رنگت نکھر آتی ہے اور سیاہ داغوں اور کیل مہاسوں سے چھٹکارہ مل جاتا ہے۔

(بحوالہ: www.sekho.com)

تاثرات: نگر نگر سے

’خواتین دنیا‘ کا مئی کا شمارہ موصول ہوا۔سابق شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی معلومات کا ذخیرہ اپنے اندر رکھتا ہے۔خواتین دنیا کا ہر شمارہ وقت پر موصول ہو جاتا ہے۔میں خواتین دنیا کی مستقل قاری ہوں۔یہ میگزین میری پہلی پسند ہے۔خواتین دنیا کے مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ہر مضمون اپنے منفرد اسلوب اور انداز بیان کے باوصف اہمیت کا حامل ہے۔

مئی 2022 کے اداریہ میں آپ نے خواتین کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔یہ بات سچ ہے کہ جب تک خواتین پڑھی لکھیں اور تعلیم یافتہ نہیں ہوں گی تب تک ہمارا معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔معاشرے کی ترقی ہی ملک کی ترقی ہوتی ہے۔خواتین نسل نو کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔لہٰذا ان کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش ملکی سطح پر کی جانی چاہیے۔

خدیجہ مستور اردو کی معروف فکشن نگار تھیں۔روبینہ پروین نے اپنے مضمون میں ان کے ناول ’ آنگن‘ کے حوالے سے بحث کی ہے۔شاعرات کے منتخب اشعار بھی قابل مطالعہ ہیں۔ڈاکٹر عطاء اللہ خاں کا ک
سنجری نے اپنے مضمون میں ’لیلیٰ کے خطوط کا‘ تانیثیت کے حوالے سے مطالعہ پیش کیا ہے۔’خواتین کی با اختیار کاری اور اعلیٰ تعلیم‘ میں خواتین کی بااختیاری اور اس کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

عصمت چغتائی کے ناول کا تجزیہ بھی عمدہ اور قابل قرأت ہے۔ ’خواتین کی خودنوشتوں میں ہندوستانی شناخت کی عکاسی‘ الگ نوعیت کا مضمون ہے۔دیگر مضامین بھی عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔

افسانوں کے تحت دو افسانے رسالے میں شامل ہیں۔نیلوفر پروین کا افسانہ ’خواہش جنوں‘ پڑھ کر اچھا لگا۔عذرا انجم کا افسانہ ’زویا‘ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔لذیذ پکوان کے تحت جو ریسیپی دی گئیں ہیں ان کو بنانے کی میں نے کوشش کی ہے۔صحت کے تعلق سے مضمون کافی معلوماتی ہے۔بیوٹی ٹپس بھی چہرے کے نکھار میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔غرض یہ کہ خواتین دنیا ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔میری طرف سے تمام قارئین کو مبارک باد!

نغمہ،نگینہ،(اتر پردیش)

□□□

عالمی چیمپئن بنیں نکہت زرین

نئی دہلی: ہندوستانی باکسر نکہت زرین کو استانبول میں خواتین کی عالمی چیمپئن شپ کے فلائی ویٹ (52 کلوگرام) زمرے کے یک طرفہ فائنل میں تھائی لینڈ کی جیتپونگ جوٹامس کو 5-0 سے شکست دے کر عالمی چیمپئن بن گئیں۔ تلنگانہ کی باکسر زرین نے متفقہ فیصلے سے تھائی لینڈ کی حریف کو شکست دی۔ اس جیت کے ساتھ ہی تلنگانہ کی باکسر زرین عالمی چیمپئن بننے والی پانچویں ہندوستانی خاتون باکسر بن گئی ہیں۔ ان سے پہلے یہ کارنامے ایم سی میری کوم (2002، 2005، 2006، 2008، 2010 اور 2018)، سریتا دیوی (2006)، جینی آر ایل (2006) اور لیکھا کے سی نے انجام دیے ہیں۔ زریں 14 جون 1996 کو نظام آباد، تلنگانہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام محمد جمیل احمد اور والدہ کا نام پروین سلطانہ ہے۔ اس ہندوستانی اسٹار نے 13 سال کی عمر میں باکسنگ گلوس سے دوستی کر لی تھی۔ وہ ہندوستانی باکسنگ لیجنڈ ایم سی میری کوم کو اپنا رول ماڈل مانتی ہیں۔ نکہت زرین ہمیشہ اپنے حقوق کے لیے لڑتی رہی ہیں۔ وہ اپنے کیریئر میں ایک بار فیڈریشن اور اپنی ماڈل میری کوم سے بھی لڑ چکی ہیں۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے خواتین کی ویمنز ورلڈ باکسنگ چمپئن شپ میں طلائی تمغہ جیتنے پر نکہت زرین کو مبارک باد دی ہے۔ انھوں نے کانسے کا تمغہ جیتنے پر منیشا مون اور پروین ہڈا کو بھی مبارک دی۔ ایک ٹویٹ میں، وزیر اعظم نے کہا' ہمارے باکسروں نے ہمیں فخر کرنے کا موقع دیا ہے! خواتین کی عالمی باکسنگ چیمپئن شپ میں طلائی تمغہ جیتنے پر نکہت زرین کو مبارک باد۔ میں اسی چیمپئن شپ میں کانسے کا تمغہ جیتنے کے لیے منیشا مون اور پروین ہڈا کو بھی مبارک باد دیتا ہوں'۔

(ہمارا سماج، 20 مئی 2022)

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

خسرو شناسی

مرتبین: ظ انصاری، ابوالفیض سحر

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 347

قیمت 180 روپے

قطب مشتری

مرتبہ: ڈاکٹر حمیرا جلیلی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 247

قیمت: 130 روپے

صارفیت اور صارفین کو قانونی تحفظ مع نظائر عدالت

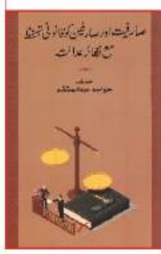

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 138

قیمت: 90 روپے

کشف الاعداد

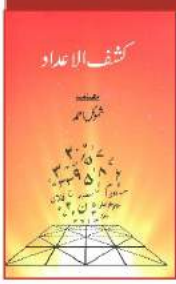

مصنف: شموئل احمد

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 190

قیمت: 110 روپے

علم البیان: اقسام نثر و نظم

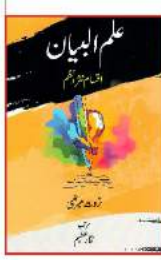

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

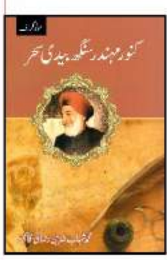

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

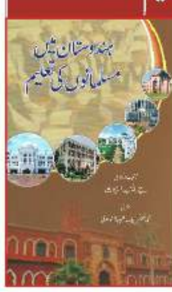

ترتیب و تدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जून-२०२२ वर्ष:६ , अंक: ६
Mahnama Khawateen Duniya Monthly June 2022, Vol.6 , Issue:6
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-06-2022
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6